اپنی شخصیت کی تلاش میں گم ہمارے بچے

ڈاکٹر عرفان شہزاد

پیش لفظ

بچہ ایک مکمل نفسیاتی وجود ہوتا ہے۔ اس کی نفسیاتی پیچیدگی بڑوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ جس شفقت اور نزاکت سے بچے کے ناتواں جسم کی پرورش کی جاتی ہے، اس کی ذہنی نشوونما اس سے زیادہ ان احساسات کی محتاج ہوتی، اور جسمانی پرورش کی نسبت زیادہ دیر تک توجہ چاہتی ہے۔

بچپنا انسان میں ہمیشہ زندہ رہتا اور اس کے رویوں اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس کی صحت مند پرورش دنیا کا اہم ترین کام ہے۔ ہم سب بچپنے کے دور سے گزرتے ہیں، لیکن عمر کی بھول بھلیوں میں بچپن کے نازک احساسات اور مسائل کہیں فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ بچوں کے ذہنی اور جذباتی مسائل بظاہر بہت چھوٹے محسوس ہوتے ہیں، مگر بچے کے دل میں جھانکیں تو بظاہر معمولی باتیں اس کی پوری دنیا تہ و بالا اور اس کی شخصیت کو مجروح کر دے رہی ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں والدین اور اساتذہ دونوں کے لیے بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق چند ایسے اہم

اور نازک امور کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر گفتگو کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ دینی اور فقہی لحاظ سے بھی چند بڑی غلط فہمیوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے، جو بچوں کی تربیت سے متعلق والدین کے تصورات اور رویوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی چلی آرہی ہیں۔

احباب اور قارئین کی طرف سے کتاب کو خاصی پذیرائی ملی، جس سے حوصلہ پاکر کچھ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن اس امید کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کہ یہ کتاب والدین اور اساتذہ کے لیے رہنمائی کا کچھ سامان بن سکے اور ہمارے بچوں کی بہتر تربیت میں مددگار ثابت ہو۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ حصہ اوّل تعلیمی تربیت اور مسائل سے متعلق ہے۔ حصہ دوم میں والدین کی تربیت کے حوالے سے مضامین شامل ہیں۔ حصہ سوم بچوں کے مسائل سے متعلق فقہی مقالات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد۔16 ستمبر 2025

حصہ اوّل: تعلیمی تربیت

اوائلِ عمر میں تصورِ خدا کی تشکیل میں والدین اور اساتذہ کے شخصی اثرات

علمِ نفسیات کی رو سے بچہ اپنے لیے خدا کا پہلا تصور اپنے والدین سے اخذ کرتا ہے۔ ماں کی مہربان شخصیت خدا کے تصور کی اولین بنیاد بنتی ہے۔ پھر باپ کی صورت میں ایک مربّی اور محافظ خدا کا تصور باقی تمام عمر کے لیے اس کے ذہن میں بس جاتا ہے۔ لیکن صرف ماں، باپ ہی نہیں، اساتذہ کی شخصیت کا تاثر بھی خدا کا پہلا تصور قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مسلمان بچے مولوی صاحب اور مسیحی بچے پادری صاحب کو خدا یا خدا کا روپ سمجھ لیتے ہیں۔

یہ ابتدائی تصورات اور تاثرات خدا کے ساتھ انسان کے ذاتی تعلق کی نوعیت طے کرتے ہیں۔ ان شخصیات کے ساتھ شفقت، محبت، احترام، خوف، اطاعت اور نفرت کے عناصر، خدا کے ساتھ فرد کے ذاتی تعلق کے احساس میں بغیر کسی شعوری کوشش کے داخل ہو جاتے ہیں۔

ناظرہ قرآن کی میری استانی جنھیں بُواجی کہتے تھے، میرے لیے ایسی ہی ایک ہستی تھیں۔ وہ بڑے جُثّے کی ایک رعب دار شخصیت کی مالک تھیں۔ گھر کے کام کرتے کرتے ہمیں قرآن کا سبق بھی پڑھاتی جاتی تھیں۔ زبان کی سخت اور دل کی نرم تھیں۔ انھیں کسی کو مارتے تو نہیں دیکھا تھا، مگر ان سے ڈر لگتا تھا۔ ان کی رعب دار شخصیت میں بچوں کے لیے دبی دبی شفقت محسوس ہوتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو میرے دل میں ان کے ڈر سے زیادہ ان سے حیا تھی۔ چُھٹی کر لیتا تو ان کا سامنا کرنے میں ڈر سے زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی، اور یہ احساس میرے لیے ڈر سے زیادہ بھاری تھا۔

میرا تصورِ خدا بُواجی جیسا تھا۔ ایک عظیم الجثّہ ہستی جو اپنے دوسرے کام کرتے کرتے ہماری دنیا کا انتظام بھی دیکھتی جاتی اور پردے میں رہ کر اپنے بندوں پر اپنی شفقت کا اظہار کرتی ہے۔ خدا سے مجھے ڈر سے زیادہ حیا آتی۔ علم و آگہی کے دور کے

بعد خدا کا تصور بہت کچھ بدل گیا، لیکن حیا نما ڈر کا تاثر آج بھی ویسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

بچپنا تمام عمر انسان کے اندر زندہ رہتا ہے۔ یہ بات افراد ہی نہیں، اقوام کے معاملے میں بھی درست ہے۔ فرد یا قوم کے تشکیلی دور میں رائج ہو جانے والا تصورِ خدا ان کے دینی مزاج میں گہرا عمل دخل رکھتا ہے۔

تقریباً ہر مذہبی روایت نے مادری اور پدری اصطلاحات میں خدا کے تصور کو پیش کیا ہے۔ مسیحیت میں خدا کے لیے باپ کا لفظ اختیار کیا گیا۔ ہندو مت میں دیوتا باپ جیسی اور دیویاں ماں جیسی ہستیاں قرار پائیں۔ دینِ اسلام کی روایت میں مخلوق کو "اللہ کا کنبہ" کہا گیا ہے۔ خدا کے لیے ربّ کا لفظ اختیار کیا گیا، جو باپ اور سرپرست کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مسلمان اپنے لیے فرزندانِ توحید اور فرزندانِ اسلام کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک مشہور مگر ضعیف روایت میں خدا کی محبت کو ستر ماؤں کی محبت کے پیمانے سے بیان کیا گیا ہے۔

ہمارے سماج میں علاقائی لحاظ سے دو بڑی مذہبی سماجی روایات پائی جاتی ہیں: ایک پختون علاقوں کی روایت اور دوسری ہندوستانی علاقوں کی روایت۔ پختون روایت میں باپ ایک سخت گیر شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اولاد سے اس کا تعلق ڈر، احترام اور اطاعت کے احساسات پر مشتمل ہوتا ہے۔ محبت فطری طور پر تو ہوتی ہے، لیکن جذباتی حدوں کو نہیں چھوتی، اظہار میں ہچکچاتی ہے۔

کم سِنی میں مدارس میں داخل کرا دیے جانے والے بچے والدین سے دور رہنے کی وجہ سے اُن کے ساتھ جذباتی تعلق پوری طرح استوار نہیں کر پاتے۔ قرآن مجید کے حفظ و ناظرہ کے لیے ہر بچہ مدرسے یا مسجد میں قاری اور حافظ صاحبان سے دوبدو ہوتا ہے۔ یہاں اساتذہ میں بھی عمومی طور پر سختی پائی جاتی ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور زد و کوب کا رواج بھی ہے۔ ان اساتذہ کے ساتھ بچے کا تعلق ادب، احترام، اطاعت، خوف، خدشے، بے زاری، لاتعلقی اور بعض صورتوں میں ظالم اور مظلوم کا ہوتا ہے۔

یہ تاثرات بچے کے تصورِ خدا اور خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ توحُّش کے احساسات ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو بچے والدین کی شفقت اور محبت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لیتے ہیں، وہ خدا کی محبت، رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی نفسیاتی وجہ ہے کہ ایک بڑے دینی طبقے میں خدا کے ساتھ ان کا تعلق محبت کی بجائے ڈر، جبر اور اطاعت پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دین پر عمل کے نام پر ان کے ہاں قانونی قسم کی اطاعت کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ قانون کے زور پر اسلام کے نفاذ میں جو دلچسپی ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے وہ دین کی روح کے ساتھ اس پر عمل کرنے کے معاملے میں نظر نہیں آتی۔ نفاذ اسلام کی کاوشوں میں جبر، خوف اور تشدد کے عناصر غالب دکھائی دیتے ہیں، لیکن ہمدردی، انسانی مشکلات کا ادراک ان کے حل کے لیے تحریک اور جستجو جیسے رویے نمایاں نظر نہیں آتے۔

مدارس میں پائی جانے والی دوسری دینی روایت ہندوستانی علاقوں کی ہے، جو وہاں سے پاکستان میں بھی آئی۔ ہندوستانی والدین اور اساتذہ عموماً زیادہ سخت گیر نہیں ہوتے۔ جذبات کا اظہار ان کے ہاں کم نہیں، بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، دین کا فقہی اور قانونی پہلو اگرچہ یہاں بھی غالب ہے، لیکن مذہب پر عمل کے معاملے میں تشدد کا رویہ کم ہے۔ صوفیانہ روایت کے تحت خدا کی رحمت اور محبت کا پرچار بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں خدا سے محبت و تعلق کے نمونے بھی زیادہ ملتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دین کے سیاسی غلبے کا نظریاتی بیانیہ رکھنے کے باوجود وہ اسے از خود بزور قوت نافذ کرنے نکل نہیں پڑتے۔

ایک تیسری جہت خدا کے تصور کو ماں کے تصور سے اخذ کرنے کی ہے،جو ایک بے اصل روایت پر مبنی ہے، جس میں خدا کی محبت کو ستر ماؤں کی محبت کے برابر قرار دیا گیاہے۔ تاہم، بخاری شریف کی ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ ایک عورت، جس کا بچہ گم ہو گیا تھا، حالتِ بے تابی میں جو بچہ اسے ملتا اسے سینے سے لگا کر دودھ

پلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے تبصرہ فرمایا: "تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "جب تک اس کو قدرت ہو گی یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا: "اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے، جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہو سکتی ہے۔" (بخاری، رقم:5222)

یہ ارشاد خدا کی رحمت کو ماں کی رحمت سے زیادہ بتا رہا ہے نہ کہ خدا کو ماں جیسا جذباتی۔ دونوں باتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ خدا رحمن و رحیم ہے، مگر جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ عدل کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ اس کے اصول اور شان کے منافی ہے۔

ان روایات کے بل پر خدا کی رحمت سے متعلق جو مبالغہ آمیزی کی گئی، اس نے فرد میں خدا کے ساتھ دلی محبت کا احساس تو پیدا کیا، مگر خدا کو ایک ماں جیسا جذباتی اور

سادہ مزاج بنا کر پیش کیا، جس سے جذباتی اپیل کر کے خلافِ عدل کام کروائے جا سکتے ہیں۔ اس تصور نے تقوی کی بنیاد ختم کر ڈالی اور دین کے تقاضوں سے بے پروائی کا جواز پیدا کیا۔

یہ تصورات قرآن مجید میں متعارف کروائے گئے خدا کے تصور سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ قرآن مجید خدا کا محفوظ کلام ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے تمام خارجی تاثرات سے خالی الذہن ہو کر خدا کا وہ تعارف حاصل کرے جو اس نے اپنے بارے میں خود بتایا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق، خدا سخت گیر باپ کی طرح ہے، نہ تشدد پسند استاد کی طرح، اور نہ ہی وہ ماں جیسی جذباتی طبیعت رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کا رب، ان کا معبود اور ان کا بادشاہ ہے[1]۔ وہ رحمن اور رحیم ہے، اور اسی لیے عادل ہے۔ عدل اس کی رحمت کا

[1] قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَٰهِ النَّاسِ (الناس،114:1-3)

نتیجہ ہے[2]، ورنہ ظالموں پر اس کی رحمت، مظلوم کے حق میں ظلم اور ناانصافی بن جاتی۔ اس کی رحمت اس کے عدل کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ خطا میں معقول عذر قبول کرتا ہے[3]، مگر سرکشی کو معاف نہیں کرتا۔ اس نے حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے سرکشوں کے لیے ابدی جہنم کی سزا مقرر کی ہے[4]۔ ان سرکشوں میں جان

تم دعا کرو، (اے پیغمبر) کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود کی

[2] كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ (الانعام،12:6)

اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور روز قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں کوئی شبہ نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل کا قیام، خدا کی صفت رحمت کا تقاضا ہے۔

[3] رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا (البقرۃ،286:2)

پروردگار، ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو اُس پر ہماری گرفت نہ کر۔

[4] وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ (النساء،14:4)

اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں وہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔

بوجھ کر خدا کا انکار کرنے والے اور مشرک[5] کے علاوہ ناحق قتل کے مرتکب[6] اور دوسروں کی جائیداد دبا لینے والے بھی شامل ہیں۔ یہ اس لیے کہ ضد بازی سے خدا کا انکار ہو یا بلا دلیل کسی کو خدا کا شریک سمجھنے پر اصرار، یا اپنے ضمیر کے فیصلے کے خلاف کسی کا ناحق قتل یا خدا کی قائم کردہ دیگر حدود سے باغیانہ تجاوز، یہ سب سرکشی کے جرائم ہیں۔ اس لیے ان سب کی سزا بھی ایک ہے۔

---

[5] إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا(**النساء**، 48:4)

اللہ اِس بات کو نہیں بخشے گا کہ (جانتے بوجھتے کسی کو) اُس کا شریک ٹھیرایا جائے۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا،[اور (اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ) جو اللہ کا شریک ٹھیراتا ہے، وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔

[6] وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا(، **النساء**، 4: 93)

اُس شخص کی سزا، البتہ جہنم ہے جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے، وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اُس کے لیے اُس نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ضروری ہے کہ بچپن اور ماحول سے ملے ہوئے تصور خدا کی درستی قرآن مجید کی روشنی میں کرلی جائے۔ اس کے لیے قرآن مجید کا شعوری مطالعہ ضروری ہے۔

جدید نظام تعلیم کی بنیادی خرابیاں

جبری تعلیم

انسانیت جبری تعلیم سے ناواقف تھی، یہاں تک کہ صنعتی انقلاب اور قومی ریاستوں کی تشکیل کے بعد یہ قومی پالیسی کے طور پر متعارف کرائی گئی۔ اس کا مقصد صنعت اور ریاست کو مطلوبہ ہنر اور قابلیت کے حامل افراد مہیا کرنا تھا۔ جبری تعلیم نے سماج کی فطری بُنَت کو شدید متاثر کیا۔

دورِ جدید سے پہلے تعلیمی ذوق رکھنے والے افراد ہی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دربار کی رونق علم و ہنر میں یکتا نورتن تھے، مگر اس رونق افروزی کے لیے خود اکبر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہ تھا۔ اشرافیہ اپنے وسائل سے وہ میدان سجاتے جہاں متوسط طبقہ اپنے علم و ہنر سے سماج کو مستفید کرتے تھا۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر فرد تعلیمی رجحان کا حامل نہیں ہوتا۔ جس طرح تعلیمی رجحان رکھنے والے بچوں کو تعلیم سے ہٹا کر کسی کام، دھندے پر لگا دینا ان کے ساتھ ظلم ہے، اسی طرح تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچوں کو حصولِ تعلیم پر مجبور کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ تعلیم پر بھرپور وسائل خرچ کرنے والے ممالک میں بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہر بچے کو رسمی تعلیم کے ذریعے سے تعلیم یافتہ بنایا جا سکے۔ کچھ بچے اوسط سے کم ذہن رکھتے ہیں۔ انھیں ذہنی مشقت میں مبتلا کرنا اذیت رسانی ہے۔

تعلیمی رجحان کی کمی کوئی بری چیز نہیں۔ ضروری مہارتیں سیکھنے کے غیر رسمی طریقے بھی کافی ہوتے ہیں۔ تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچے ہم نصابی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تکنیکی ذہن رکھتے ہیں، چیزوں کو کھولنے جوڑنے میں ہوشیاری دکھاتے ہیں۔ کچھ کھیل کود میں عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض کھیتی باڑی یا

جانور وغیرہ پالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، کچھ کاروباری صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ گھر داری، تصویر کشی، فیشن ڈیزائننگ اور بیوٹیشن وغیرہ کی ہنر مندیوں میں ان کے رجحانات اظہار پاتے ہیں۔

ایسے ہنر منداور کاروباری افراد کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں جو کسی رسمی تعلیمی چکر میں پڑے بغیر اپنی مرضی کے شعبے میں عمدہ کارکردگی دکھاتے ہیں۔ یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ کاروبار یاہنر سیکھنے کے لیے دس بارہ سال کی عمومی رسمی تعلیم کی پابندی غیر ضروری ہے، نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچوں کے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہے۔ ان بچوں کو ان کے طبعی رجحان کے مطابق آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے تو اکثر اپنے فطری میدانِ عمل میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر رائج نظامِ تعلیم میں ہر بچے کو کم از کم دس بارہ سال رسمی تعلیم کی چکی میں پیسنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچے کے دل و دماغ پر

ایک ناگوار کام مسلسل کئی برس تک کرتے رہنے کی اذیت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا احساس تک موجود نہیں۔

حصولِ تعلیم کے جبر کے خلاف ایسے بچے جب مزاحمت کرتے ہیں تو باغی اور کام چور سمجھتے جاتے ہیں۔ اپنی ہی نظر میں مجرم بنا دیے جاتے ہیں۔ انھیں زبردستی تعلیم دلا بھی دی جائے تو بہت محنت کے بعد بھی معمولی کارکردگی ہی دکھا پاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ معمولی تعلیم کی وجہ سے وہ ڈھنگ کی ملازمت پانے میں بھی ناکام رہتے ہیں اور اپنے طبعی ٹیلنٹ کو برتنے کی مسرت اور اس کے ذریعے سے ممکنہ کامیابی کے فخر سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

تعلیم بے زار طلبا امدادی کتب سے تیاری کرتے، اسائنمنٹس کاپی کرتے، امتحانات میں نقل کرتے اور شارٹ کٹس میں لگے رہتے ہیں، پھر کم گریڈز کی وجہ سے مغموم اور شاکی بھی رہتے ہیں۔ اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے قیمتی وقت اور وسائل کا بہت

بڑا حصہ ان کے تعلیمی نقائص دور کرنے اور سرقے (Plagiarism) کے حیلوں سے نمٹنے میں لگتا ہے، مگر خاطر خواہ نتیجہ پھر بھی نہیں نکلتا اور نہ نکل سکتا ہے۔

رسمی تعلیم میں ناکامی یا غیر اطمینان بخش کارکردگی کے بعد جب ان بچوں کو پیشہ ورانہ تعلیم یا کاروبار کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، تب تک ان کا بہت وقت ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بچے اگر اپنا قیمتی وقت اپنے طبعی رجحان کے مطابق بروقت درست مصرف میں لگائیں تو پیشہ ورانہ زندگی میں بہت جلد مناسب مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے دوران ہی میں بچے کے رجحانات دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ اسے مزید تعلیم دلانی ہے تو کس قسم کی تعلیم اس کے طبعی رجحان کے مطابق مفید رہے گی اور اگر تعلیم اس کا میدان نہیں تو پھر کون سا شعبۂ زندگی یا ہنر اس کے لیے بہتر رہے گا۔

سماج میں رتبے اور معاش کو تعلیم سے منسلک کرنے دینے سے ہر طبقہ حصول تعلیم کی دوڑ میں شامل ہونے پر مجبور ہوا۔ اشرافیہ کے لیے ڈگری اہم نہیں ہوتی اور ملازمت اختیار کرنا بھی عموماً وہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن، لوگوں کی نظروں میں عزت پانے کے لیے وہ تعلیم کی راہ داریوں میں چکر لگانے لگے۔ جب کہ غریب اس آس میں کہ اس کا بچہ کوئی ڈگری پا کر اچھی ملازمت پالے، اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس بھیڑ چال کا حصہ بن گئے۔ یوں ملکی وسائل پر بے جا بوجھ میں اضافہ ہوا۔

اس چکر میں سب سے زیادہ نقصان غریب کا ہوا۔ اپنے تمام وسائل بچوں کی تعلیم میں جھونک کر بھی وہ انھیں معیاری تعلیم نہیں دلا سکتا۔ کسی نمایاں کامیابی کے لیے اس کے بچے کا نہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہونا بلکہ خوش قسمت ہونا بھی ضروری ہوتا ہے، اور ایسے کتنے ہوتے ہیں؟ ایسے چند خوش قسمت اور غیر معمولی افراد باقی سب معمولی بچوں کے لیے مثال بنا دیے جاتے ہیں اور وہ ان کی چال چلنے

کی کوشش میں اپنی راہ بھی کھوٹی کر لیتے ہیں۔ معمولی درجے کی تعلیم سے اچھی ملازمت بھی نہیں ملتی اور غریب کا بچہ اب چھابہ لگانے یا کسی دکان پر بیٹھنے کے لیے بھی تیار ہوتا ہے۔ اچھی دفتری ملازمت کا خواب جو اس کی آنکھوں میں سجایا جاتا ہے، تمام عمر ایک ناتمام حسرت بن کر اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

فرد کی عزت اس کے ہنر، خدمات اور کردار کی بنا پر ہونی چاہیے نہ کہ تعلیمی ڈگری کی بنا پر۔ تعلیم اور ڈگری کی بنیاد پر کم تری اور برتری کے تصورات کی نفی کی ضرورت ہے۔

رسمی تعلیم کی پابندی کاروباری خاندان کے بچوں کے لیے بھی بعض اوقات ناگوار صورتِ حال کا باعث بنتی ہے۔ ڈگری کے حصول کے بعد جب وہ ملازمت اختیار کرتے ہیں تو کاروباری آمدنی کے مقابلے میں ملازمت کی نسبتاً کم تر آمدنی سے بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کاروبار کی طرف رخ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر ہو چکی۔

ایک اچھا کاروباری ذہن عموماً تعلیم میں بہت اچھا نہیں دیکھا گیا، اور اچھی تعلیمی استعداد کا حامل اکثر اچھا کاروباری ذہن نہیں رکھتا۔ بچوں کے کیریئر کے انتخاب میں ان کی مدد کرتے ہوئے اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

سماجی شعور، علم اور تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ مروجہ رسمی تعلیم کا اس میں کوئی کردار نہیں، خصوصاً سائنسی مضامین کا فرد کے سماجی اور سیاسی شعور میں اضافے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ البتہ عُمرانیات، بشریات، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات جیسے کے علوم اگر عملی زندگی سے متعلق کرکے پڑھائے جائیں تو شعور کی آب یاری میں معاون ہوسکتے ہیں۔ تعلیمی مصروفیات بچوں کو عملی سمجھ بوجھ سے دور کرنے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ اس کے برعکس، جو بچے تعلیم کی طرف کم رجحان رکھتے ہیں، عملی سمجھ بوجھ میں اکثر فائق نظر آتے ہیں۔

"تعلیم سب کے لیے" اس بیانیے کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک روایت سے بھی کی جاتی ہے، جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ علم حاصل

کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی دین کا ابلاغ تھا، اورآپ کے بیان میں علم سے مراد دین کا علم ہے۔ دنیاوی علوم کی ترغیب کے لیے پیغمبر کو تلقین کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان یہ علوم اپنی ضروریات اور ترقی کے جذبے کے تحت ہمیشہ سے حاصل کرتا آیا ہے۔ درج بالا روایت میں مذکور لازمی علمِ دین بھی اتنا ہی قرار دیا جا سکتا ہے جو ضروریاتِ دین سے متعلق ہو۔ ہر شخص سے عالمِ دین بننے کا مطالبہ مراد نہیں ہو سکتا، یہ عملاً ممکن نہیں، نیز، خود قرآن مجید نے علم دین کے حصول کے لیے چند لوگوں کے انتخاب کو کافی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (سورہ توبة، 9: 122)

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مسلمان، سب کے سب نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت پیدا کرتے اور

اپنی قوم کے لوگوں کو (اُن کے اِن رویوں پر) خبر دار کرتے، جب اُن کی طرف لوٹتے، اِس لیے کہ وہ خدا کی گرفت سے بچتے؟

بچوں سے بالجبر قرآن مجید حفظ کرانا ایک انوکھا رواج ہے جو مسلمانوں میں رائج ہو گیا۔ صحابہ ءِ کرام کے ہاں اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ قرآن مجید کی تلاوت کی طرح اس کا حفظ بھی سب اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کیا کرتے تھے۔ پورا قرآن زبانی یاد کرنا فرض ہے نہ واجب اور نہ ہی زندگی کی بنیادی ناگزیر مہارتوں میں شامل ہے کہ اس کے لیے بچے پر جبر کی اجازت دے دی جائے۔ کوئی فرد، خواہ وہ بچہ ہو یا بڑا اسے حفظ قرآن پر مجبور کرنا اس کا استحصال ہے۔ حفظ قرآن اپنے ذوق، صلاحیت اور شعوری انتخاب کا معاملہ ہے۔ اور شعوری انتخاب، شعور کی عمر کو پہنچ کر ہی معتبر ہو سکتا ہے۔ بچوں کو اپنے شوق کی نذر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تعلیم اگر صرف وہی افراد حاصل کریں جو پڑھنے لکھنے کا طبعی رجحان رکھتے ہیں تو دستیاب محدود وسائل میں یہ بہترین لائحہ عمل ہو گا۔

بچے کی تعلیم کی ابتدا پانچ یا چھے سال کی عمر سے پہلے نہیں کرانی چاہیے۔ اس سے پہلے اسکولوں میں ان کا داخلہ ان پر ناروا جبر ہے۔ ابتدائی پانچ چھے برس کی لا ابالی عمر نیند پوری کرنے، کھیلنے کودنے اور خود سے کھوجنے کی ہے۔ اسے روٹین اور وقت کی پابندی کے ذہنی تناؤ اور کام کی جواب دہی کے خوف کی نذر کرنا معصوم بچے کے ساتھ زیادتی ہے۔ ان کی نیند سے انھیں محروم کرنا، ان کے دماغی نقصان کا باعث اور ان کی فطری نشو و نما میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ بچے کا ذہن سوال کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وقت سے پہلے ملنے والے جوابوں کے سامنے اس کی متجسّس ذہانت کمھلا کر رہ جاتی ہے۔ ابتدائی نوعیت کی مہارتیں جو گھر کے بے تکلف ماحول میں اپنی سہولت سے سیکھنے کی ہیں، انھیں قبل از وقت سکھانے کی کوشش میں بچے کا قیمتی وقت اور اپنا قیمتی سرمایہ ضائع کیا جاتا ہے۔

کم سن بچوں کی نگہ داشت اور ابتدائی تعلیم کے لیے اداروں کا قیام ملازمت پیشہ ماؤں کی ضرورت تھی۔ کاروباری مفاد کی خاطر اسے فیشن کا روپ دے دیا گیا۔ اب

حال یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ تین سال عمر تک کسی اسکول میں داخل نہ کرایا گیا ہو تو والدین کو احساس کم تری ستانے لگتا ہے کہ جیسے ان سے کوئی جرم یا کوتاہی سرزد ہو رہی ہے۔ حالاں کہ اصل جرم اتنے کم سن بچوں کو اپنے دامن شفقت سے جدا کر کے اسکول میں داخل کرانا ہے۔

ان مسائل کے حل کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

- کم از کم پانچ سال کی عمر سے پہلے اسکول یا مدرسے میں بچوں کے داخلے کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اس پر پابندی عائد کی جائے۔
- اسکولوں میں کم سن بچوں کی تعلیم کا دورانیہ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ بارہ سال سے کم عمر بچوں کے لیے یہ اوقات تین یا چار گھنٹے سے زیادہ اور ہفتے میں تین یا چار دن سے زائد نہیں ہونے چاہییں۔ ان کے اسباق کا وقت دس بجے سے پہلے شروع نہیں کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی نیند پوری کر سکیں۔

- پرائمری کی سطح کی تعلیم لازم ہونی چاہیے تاکہ بچے بنیادی مہارتیں سیکھ لیں۔ اس کے بعد بچوں کا رجحان پرکھنے کا جامع طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔ اس کے لیے ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ نفسیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔ صرف منتخب بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق رسمی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے اگلے مراحل میں بھیجا جائے۔ یوں تعلیمی اخراجات میں خاطر خواہ کمی آئے گی اور کم وسائل سے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں گے۔ حکومت پر نوکریاں پیدا کرنے کا بوجھ بھی کم ہو جائے گا۔
- مبنی بر ہنر (سکل بیسڈ) ملازمتوں میں ڈگری کی شرط ختم کر کے براہ راست قابلیت کی جانچ کر کے ملازمتیں دی جائیں۔
- ملازمت میں ترقی کا معیار ڈگری کی بجائے کارکردگی، سینیارٹی اور تجربے کو بنایا جائے۔

دوسری طرف رسمی تعلیم سے باہر ہونے والے بچے اپنے ٹیلنٹ کے مطابق دیگر پیشوں اور کاروبار میں مشغول ہو کر اپنے اور سماج دونوں کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

بچپنے کی طوالت

دور جدید نے تعلیم کی تکمیل کا دورانیہ فرد کی اوسط عمر کے ایک تہائی اور بعض صورتوں میں نصف عمر کو محیط کر دیا، جس کے بعد ہی عملی زندگی میں شمولیت اختیار کی جاسکتی اور کسب معاش کے ساتھ خود مختاری کا سفر شروع کیا جاسکتا ہے۔

اس سے پہلے وقتوں میں بچے تیرہ، چودہ سال کی عمر میں گھر بار اور کاروبار زندگی سنبھالنے کے لیے تیار ہو جایا کرتے تھے۔ ٹین ایج ہی میں وہ انتظامی اور حکومتی عہدوں پر کام کرتے، بلکہ حکم رانی بھی کرتے تھے۔ لیکن دور جدید میں ٹین ایجرز بچے قرار دے دیے گئے، جو نہ ڈرائیونگ کرنے کے قابل ہیں، نہ ووٹ ڈالنے کی

اہلیت رکھتے ہیں، نہ باقاعدہ ملازمت اختیار کر سکتے ہیں اور نہ شادی کرنے کے لائق ہیں۔

اگلے وقتوں میں بچے بالغ ہوتے ہی عاقل بھی ہو جاتے تھے، اسی لیے 'عاقل بالغ' کی ترکیب زبان میں جگہ پا گئی۔ دور جدید کے تعلیمی نظام نے بلوغت اور عقل کے درمیان فاصلہ بہت طویل کر دیا ہے۔ عملی زندگی سے دور، بلکہ اس سے محفوظ رکھ کر دی گئی تعلیم ایک بالغ کو عاقل ہونے ہی نہیں دیتی، جب تک کہ وہ طویل تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم نہ رکھے اور کچھ برس گزار کر خود مختار ہونے کی سعی نہ کر لے۔

اس کے نتیجے میں والدین پر انحصاری کی مدت میں اضافہ ہوا اور شادی بھی تاخیر کا شکار ہو گئی۔

دور جدید کی دانش نے اپنی پیدا کردہ اس تبدیلی کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اسے ہی معیاری قرار دے کر ماضی کی کم سنی کی ملازمت اور شادیوں پر نکتہ چینی کی۔ اب

کم سنی کی ملازمت چائلڈ ابیوز اور اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادی بالغوں کا استحصال کہلاتی ہے۔ حالانکہ وہ بزرگ ابھی زندہ ہیں جنھوں نے کم سنی میں کاروبار زندگی سنبھالا اور کم عمری میں شادیاں کیں اور ایک نارمل زندگی گزاری۔

دور جدید اس مخمصے سے دوچار ہے کہ جو نظام اس نے تشکیل دے دیا ہے اس کے مطابق فطرت کو چاہیے کہ بلوغت کم سے کم سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں واقع ہوا کرے، مگر فطرت اپنا معمول تبدیل کرنے پر تیار نہیں۔ جنسی جذبات اپنے وقت پر نمودار ہوتے اور تسکین چاہتے ہیں۔ چنانچہ سماج اپنے غیر فطری نظام کے ساتھ فطرت کے ساتھ ایک جنگ میں مبتلا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے ایک کے بعد ایک سمجھوتے کرنے پڑ رہے ہیں کیونکہ فطرت کے خلاف جنگ ہمیشہ ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ جنسی جذبات تو ٹین ایج میں نمودار ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی شادی نہیں ہو سکتی، کیونکہ شادی ایک خاندان کی ذمہ داری اٹھانے کا نام ہے، جو

ایک ٹیم ایجرز اٹھا نہیں سکتا، کیونکہ وہ کمانے کے لائق نہیں۔ چنانچہ بغیر شادی اور بغیر ذمہ داری اٹھائے جنسی تسکین کا مطالبہ پیدا ہوا۔ مطالبہ پیدا ہوا تو جواز بھی پیدا کر لیا گیا۔ لیکن پھر اس غیر ذمہ دارانہ تعلق کو نئے قاعدوں کا پابند کرنے کی سعی کی گئی۔ قانون بنایا گیا کہ سولہ یا اٹھارہ سال سے کم عمر افراد جنسی تعلق قائم نہیں کر سکتے۔ مگر جنسی جذبات کو لگام دینا مشکل تھا۔ چنانچہ اب یہ گوارا کیا جانے لگا کہ دو کم سن جنسی تعلق قائم کر لیں تو حرج کی بات نہیں۔

جنسی تعلق سے بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور شادی کے بغیر ان کی ذمہ دارانہ پرورش کا کوئی چارہ موجود نہیں۔ چنانچہ حمل روکنے کے ذرائع پیدا ہو گئے، بلکہ حمل کو ضائع کرنے کا جواز بھی پیدا کر لیا گیا۔ مقام حیرت ہے کہ وہ سماج جہاں ایک نومولود جانور کی موت کو برداشت نہیں کیا جاتا، وہاں انسانی جنین کو قتل کرنا جائز سمجھ لیا گیا، اور اسے حاملہ کا حق تسلیم کیا گیا۔

اب بغیر شادی کے بچے پیدا ہو ہی جائیں تو اس کے بائیولوجیکل باپ کو ان کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور اگر وہ میسر نہ ہو تو جدید ریاست نے بھی ایسے بن باپ کے بچوں کی پرورش میں سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی۔

بغیر شادی کے جنسی تسکین کا راستہ کھلا تو شادیاں مزید تاخیر کا شکار ہو گئیں کیونکہ شادی کے ساتھ ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جنسی آزاد روی کی گنجایش بھی نہیں رہتی۔ جب کہ شادی کے بغیر ساتھ رہنے میں یہ سہولت ہے کہ جب چاہیں تعلق ختم کر سکتے ہیں، کوئی قانونی پیچیدگی بھی آڑے نہیں آتی۔

ان نئی سماج تشکیلات سے خاندان کے ادارے کو جو زک پہنچی، باہمی تعلقات جس غیر یقینیت کا شکار ہوئے اور اس غیر یقینیت کا فائدہ اٹھا کر جوڑے ایک دوسرے کا اور بن شادی کے پیدا ہو جانے والے بچوں کا جو استحصال کرتے ہیں وہ بحث و نظر کا ایک الگ میدان ہے۔

تاہم یہ سب زیادہ تر مغربی تہذیب میں ہو رہا ہے۔ مشرقی ممالک، جہاں بغیر شادی کے جنسی تعلق کو جواز نہیں دیا جاسکا، وہاں اس جدید نظام تعلیم اور اس پر مبنی سماجی نظام کی وجہ سے شادی میں تاخیر جنسی تسکین کے دیگر ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جو ان گنت مسائل کا سبب ہے۔

ایک کے بعد ایک نتائج کا سلسلہ جس جڑ سے جڑا ہوا ہے وہ دور جدید کا نظام تعلیم ہے، جو بچے کو عملی زندگی سے کاٹ کر تعلیم دیتا اور فرد کے بچپن کی عمر کو غیر معمولی طور پر طویل کرنے کا باعث ہے۔ جہاں کم سنی کی شادیوں پر تنقید ہوتی ہے، وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ خود دور جدید کن غلط راہوں پر گام زن ہے۔

تربیت اور تعلیم گاہیں

تربیت عملی نوعیت کا کام ہے جو تنوع اور انفرادی توجہ چاہتا ہے۔ اس لیے یہ محض تعلیم، لیکچر، وعظ یا نصاب کا موضوع نہیں بن سکتا اور نہ گروہی سطح پر تربیت سے مطلوبہ نتائج دے سکتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے سے چند اخلاقی قواعد اور سماجی قوانین کا علم ہی دیا جا سکتا ہے، مگر مکمل تربیت جو ہمہ جہت تجربات کا تقاضا کرتی ہے، اس کی تربیت نہیں دے سکتا۔

تربیت کرنا اصلاً خاندان کے کرنے کا کام ہے۔ معاشرہ اس کی تجربہ گاہ ہے۔ خاندان کا ادارہ جب کم زور ہوا تو اسکولوں نے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے۔ وحدانی خاندان یا سنگل فیملی یونٹ کی تشکیل اور ماؤں کی ملازمت نے بچوں کی نگہ داشت کے مسائل پیدا کیے تو اسکولوں نے کنڈر گارٹن اور پلے گروپ متعارف کروائے، جہاں بچے کی نگہ داشت اور اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں درکار والدین کی تربیت کا بدل مہیا کرنے کی کوشش کی گئی۔

مشترکہ خاندان جو پہلے گاؤں کی حویلیوں میں رہتے تھے، جب شہروں کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں محدود ہوئے تو بچوں کی کثرت نے شور و ہنگامہ پیدا کیا مگر ان کی انفردی تربیت کے لیے درکار ماحول مفقود ہوگیا۔ چنانچہ نہ صرف چھوٹے بچوں کو بلکہ بڑے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری بھی تعلیم گاہوں پر آن پڑی۔

تعلیم گاہیں فرد کو نہیں جماعت کو مخاطب کرتی ہیں، جب کہ تربیت کے لیے انفرادی توجہ درکار ہوتی ہے۔ ہر فرد مختلف انداز سے تربیت قبول کرتا ہے۔

تعلیم گاہوں میں جو تربیت ہوتی ہے وہ چند امور میں نظم و ضبط، دفتری آداب، دفتری بول چال کی تربیت ہے۔ یہ بول چال معاشرے کی بول چال سے مختلف ہوتی ہے۔ اس تربیت میں تمام سماجی آداب شامل نہیں ہوسکتے۔ ہمہ پہلو تربیت جو خاندان ہی کا ادارہ کر سکتا تھا، اس کی کمی تعلیم گاہ پورا نہیں کر سکتی۔ بچوں کے پاس وہ متنوع قسم کے عملی نمونے نہیں تھے جو انھیں مختلف دائروں کی سماجی تربیت بغیر سکھائے سکھا سکتے۔ اس کمی کو پند و نصائح اور ڈانٹ ڈپٹ سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

تربیت اصلا استاد کا کام نہیں اور نہ وہ کر سکتا ہے۔ تدریس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں تربیت جیسے ہمہ پہلو تربیت کی گنجایش ہے اور نہ وقت۔ جو اساتذہ طلبہ کی تربیت میں مصروف ہوتے ہیں انھیں اپنی تدریسی ذمہ داریوں پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کے عمل سے جتنی تربیت ممکن ہے طلبہ کو بس وہی ملتی ہے۔

اساتذہ کے ذریعے سے تربیت دینے میں دوسرا بڑا مسئلہ اساتذہ کے ذاتی عقائد، نظریات اور تعصبات کا ہے۔ تربیت کے نام پر وہ اپنے ایسے خیالات کا پرچار کر سکتے ہیں جو دوسروں کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔

تعلیم گاہوں سے ہی اگر تربیت کرانا مقصود ہو تو لازمی ہے اس کا بھی منظور شدہ نصاب ہو تاکہ معلوم ہو کہ تربیت کے نام پر بچوں کو کیا سکھایا جائے گا۔ نیز ہمہ پہلو تربیت کی عملی نوعیت کے پیش نظر تربیت کا وقت تدریس سے الگ اور طریقہ عملی نوعیت کا ہونا چاہیے، جہاں بچوں کو انفرادی توجہ دی جا سکے۔ تاہم، یہ سب پھر بھی خاندانی تربیت کا بدل نہیں بن سکتا۔

جدید نظام تعلیم نے اسکول کو پورے سماج کی ذمہ داری اٹھانے کی راہ پر ڈال رکھا ہے۔ اسکولوں سے بچوں کو وہ کچھ سکھانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو دراصل خاندان اور سماج میں سکھایا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ جو کام خاندان کے کرنے کا ہے اس کے لیے خاندان ہی کو ذمہ دار بنایا جائے اور انھیں اپنی بھولی ہوئی ذمہ داریاں یاد کروائی جائیں۔ اولاد پیدا کرنے سے پہلے مرد و عورت یہ دیکھ لیں کہ وہ ان کی خاندانی تربیت کا کیا انتظام رکھتے

ہیں۔ بچوں کی پرورش میں ان کی تربیت کو وہ اپنی خاندانی منصوبہ بندی میں اولین ترجیحات میں شامل کریں۔

بچوں کو قرآن حفظ کرانا

عہدِ رسالت سے قرآن مجید حفظ و تحریر دونوں طریقوں سے محفوظ کرکے آئندہ نسلوں کو منتقل کیا گیا۔ قرآن مجید کو مسلمانوں کے اجتماعی حافظے میں محفوظ کرکے حفاظتِ قرآن کا ایسا اہتمام کیا گیا جس نے اس میں کسی غلطی یا کمی بیشی در آنے کے ادنی شائبے کے لیے بھی کوئی گنجایش نہ رہنے دی۔

قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ عرب معاشرے میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا۔ کتابت کے ذرائع بھی کم یاب تھے۔ رسم الخط بھی اس درجہ ترقی یافتہ نہ تھا کہ زبانی قراءت کے بغیر پورے متن کی درست پڑھائی ہر ایک کے لیے ممکن ہوتی۔ چنانچہ وسیع پیمانے پر قرآن مجید کی تلاوت، حفاظت اور اس کی تعلیم و ترسیل کے لیے اسے زبانی یاد کرنا ناگزیر بھی تھا۔ صحابہ اور تابعین اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق قرآن مجید مکمل یا جزواً یاد کرلیتے تھے۔ لیکن رسمی حفظِ قرآن، خاص طور پر بچوں کو بالجبر قرآن یاد کرانے کا کوئی تصور نہ تھا۔

ادھر مسلمانوں کو ایک طویل عرصے سے یہ باور کرایا گیا ہے حفظِ قران کے لیے بہترین عمر بچپن کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک حافظِ قرآن اپنے خاندان کے دس ایسے افراد کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی، [7] حافظِ قرآن کے والدین کو روزِ قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج

[7] لِحَامِلُ الْقُرْآنِ إِذَا أَحِلَ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَنْ يَشْفَعَ فِي عَشْرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتَهُ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ(المعجم الأوسط، 5258)

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

اسے علامہ البانیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعیف الجامع الصغیر وزیادته، رقم: 4662)

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

مَن قرأَ القرآنَ واستَظهرَهُ فأحلَّ حلالَهُ وحرَّمَ حَرامَهُ أدخلَهُ اللَّهُ بِهِ الجنَّةَ وشفَّعَهُ في عَشرةٍ من أهلِ بَيتِهِ كلُّهم قَد وجبَت لَهُ النَّارُ (الترمذی:2905)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانیؒ نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعيف الترمذي، رقم: 2905)

کی روشنی سے بھی زیادہ ہو گی[8]۔ ان ترغیبات کے زیرِ اثر والدین یہ سعادت حاصل کرنے اور جہنم سے بچنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ گلی، محلوں، گاؤں اور شہروں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے حفظ قرآن کے مدارس ایسے ہی بچوں سے آباد اور ایک بڑے طبقے کے معاش کا ذریعہ ہیں۔

حفظِ قرآن کی فضیلت سے متعلق مُحوّلہ بالا روایات ضعیف ہیں۔ یہ دین کے مسلّمہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں۔ قرآن مجید ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار

[8] حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، عَنْ زَبَّانِ بْنِ فَائِدٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا؟ (مشكاة المصابيح: 2139)

معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہو گی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمہارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہو گا"۔ (علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔) (مشکاۃ المصابیح، رقم: 2139)

ٹھہراتا ہے،[9] وہ بتاتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کوئی کسی دوسرے کے کام نہیں آ سکے گا، وہاں سفارش کی اجازت کچھ ایسے لوگوں کے لیے ملے گی جن کے لیے جہنم کا فیصلہ نہیں ہوا ہو گا مگر ان کے اچھے اعمال بھی اس قابل نہ ہوں گے کہ انھیں جنت کے لائق بنا دیں۔ البتہ، وہ لوگ جن کے لیے جہنم کا فیصلہ ہو جائے گا، انھیں کسی کی سفارش کام نہ آئے گی۔

ارشاد ہوا ہے:

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (بقرة، 2: 48)

اور اُس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اُس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔

مگر والدین ان بر سر خود غلط ترغیبات سے متاثر ہو کر اپنے کم سن بچوں کو زبردستی حفظ کرانے کے لیے کسی مدرسے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ بلکہ ترجیحاً اپنے گاؤں، محلے

9 {كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ} [مدثر، 74: 38]

ہر متنفس (اُس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہو گا۔

اور گھر سے دور کسی مدرسے میں انھیں داخل کراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے علاقے اور گھر کے قریب کے مدرسے میں بچے کی توجہ اپنے خاندان اور دوستوں سے ملنے کی تڑپ میں منتشر رہتی ہے، اس لیے بچے کو ان سب سے دور بھیج دیا جائے، جہاں وہ کوئی شناسا نہ پائے اور پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

مدارس میں بچوں کے داخلے کی ایک دوسری وجہ والدین کی غربت ہے۔ بچے کو پیش آنے والے تمام ممکنہ حادثات اور خدشات کے باوجود والدین اپنے بچوں کو مدارس میں داخل کرا دیتے ہیں کہ مدرسے کے خرچ پر پل کر وہ بڑے ہو جائیں اور اس دوران میں کچھ تعلیم بھی حاصل کر لیں جو بعد میں ان کے کام بھی آ سکتی ہے۔ راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی۔ انھیں خبر کی گئی، وہ آئے، بچے کو تسلی دی اور اسی مدرسے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظِ قرآن

مکمل کرائے بغیر وہ اسے واپس لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے لیے ایسے حادثات غیر متوقع نہیں تھے۔ ان خدشات کو گوارا کرتے ہوئے ہی وہ اپنے کم سن بچوں کو اجنبی ماحول کے سپرد کر آتے ہیں۔

والدین کی شفقت اور احساسِ تحفظ سے محروم ہو جانے کے بعد ایک اجنبی ماحول میں بچہ جس جذباتی المیے سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچپن کی بے فکری کا یہ خوب صورت دور ایک سخت روٹین کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے۔ ایک محدود ماحول میں مقید ہو جانے سے معاشرتی رویے سیکھنے کے مواقع بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ مختلف عمر اور مزاج کے لڑکوں اور اساتذہ کے درمیان اس کی معصومیت بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بچہ جتنا کم عمر، خوش شکل اور والدین کی خبر گیری سے دور ہوتا ہے، اس کے استحصال کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

بچے سے قرآن حفظ کروانے کے لیے والدین نہ صرف خود اس پر تشدد کرتے ہیں بلکہ اساتذہ کو بھی اس کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بے اصل روایت بھی مشہور کرا رکھی ہے کہ جسم کے جس حصے پر استاد کی مار پڑتی ہے اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ تشدد کی صورت میں بچہ اگر زخمی ہو جائے یا، خدانہ خواستہ، اس کی موت واقع ہو جائے تو والدین عموماً استاد کو معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق بچہ خدا کی راہ میں شہید ہو گیا۔ یوں والدین کی آخرت سنور گئی۔ یہی ان کا نصب العین تھا، جو قبل از وقت حاصل ہو گیا۔ اس 'خدمت' کے عوض استاد کو سزا کیوں دی جائے؟ سزا سے مامونیت کی یہ توقع تشدد پسند طبائع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

کچھ بچوں میں اتنی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ پورا قرآن یاد کر سکیں۔ راقم کے تجربے میں ایسے والدین بھی آئے جنھیں بتایا گیا کہ ان کا بچہ حفظ نہیں کر سکتا، لہٰذا اسے مجبور نہ کریں۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بضد

رہے کہ بچے کو ہر صورت حفظ کرایا جائے۔ ان کے مطابق، حفظ کرنے کی محنت سے دماغ تیز ہو جاتا ہے۔ ایسے بچوں کو برسوں حفظ کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔ سبق یاد نہ کر سکنے کی پاداش میں سب کے سامنے مار پیٹ اور ذلت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، اس وجہ سے ان کی یاداشت کام نہیں کر رہی، اور یہ کہ حافظِ قرآن کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ شیطان لگے ہوتے ہیں جو اسے حفظِ قرآن کی سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورت حال کسی اذیت گاہ (ٹارچر سیل) سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ ہر صبح یہ سوچ کر اٹھتا ہے کہ تشدد اور ذلت کا ایک اور طویل دن اس کا منتظر ہے۔ وہ خود کو گناہ گار سمجھتا ہے جس سے اس کے والدین راضی ہیں نہ اساتذہ اور نہ ہی خدا۔ ہم مکتب ساتھیوں کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وَقعت نہیں ہوتی۔ ایسے بچے مدرسے اور گھر سے بھاگ جاتے ہیں تو پکڑ پکڑ کر لائے جاتے ہیں اور بھاگنے پر مزید تشدد اور ذلت سہتے ہیں۔ ان کی عزتِ نفس ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر منفی

نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیتی ہے اور مختلف منفی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بہت سے طلبا میں انھی وجوہات سے قرآن مجید سے بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات کے مطابق، خدا کا پہلا تصور والدین سے ملے تاثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں اساتذہ کی شخصیت کے تاثرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم اور اساتذہ کی سختیوں سے گھائل ان بچوں میں خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ توحُّش کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لینے کے بعد وہ خدا کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ والدین سے ناراض ہوتے ہیں مگر ان کی ناراضی سے ڈرتے بھی ہیں۔ اسی طرح وہ خدا سے بھی محبت نہیں کر پاتے، لیکن اس کے ڈر کے احساس سے اس کی رسمی اور قانونی قسم کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کی یہی نفسیات لوگوں کے ساتھ ان کے

تعلقات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عام طور پر خوف دلاتے اور جبر اور دھونس سے بات منواتے نظر آتے ہیں۔

بچہ ہو یا بڑا اس کی مرضی کے بغیر اسے کسی ایسی ذہنی یا جسمانی مشقت میں مبتلا کرنا، جس کا مطالبہ دین اور عقل نہیں کرتے، اس کا استحصال ہے۔ حفظِ قرآن ان بنیادی مہارتوں کی تعلیم نہیں ہے جن کا سیکھنا ناگزیر ہوتا ہے اور اس بنا پر انھیں بچپن میں زبردستی بھی سکھایا جاتا ہے، جیسے لکھنا پڑھنا، ابتدائی ریاضی وغیرہ۔ حفظ قرآن ایک تخصیصی تعلیم ہے اور تخصیصی تعلیم بچے کا رجحان جانچے بغیر نہیں دی جا سکتی۔ جس طرح کسی بچے کے کیریئر کے لیے میڈیکل یا انجینئرنگ کی تعلیم کے حصول کا فیصلہ اس کے بچپن میں نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اسے حفظ کرانے کا فیصلہ بھی اس کے بچپن میں نہیں کیا جا سکتا۔

والدین کو بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا کوئی مطلق اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہاں مریم علیہا السلام کے واقعہ سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی والدہ نے ان کی

پیدایش سے پہلے ہی انھیں خدا کے نام پر وقف کر دیا تھا، اس لیے والدین کو بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا حق ہے۔ یہ، درحقیقت، مریم علیہا السلام کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو دین کی خدمت کے لیے خدا کے نام پر وقف کر دیں۔ قرآن مجید میں ان کی دعا ان کی اسی خواہش کا اظہار ہے۔[10] مگر مریم علیہا السلام پر اس کیریئر یا طرز زندگی کو اختیار کرنے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایسے ہی جیسے بچپن میں طے کیے گئے نکاح کو برقرار رکھنے کی پابندی بچوں پر نہیں ہوتی۔ وہ شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچ کر ایسے نکاح سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مریم علیہا السلام کی اپنی طبیعت بھی اسی کام کی طرف مائل رہی

[10] إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ(آل عمران، 35:3)

اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔

جس کی خواہش اور دعا ان کی والدہ نے کی تھی۔ پھر یوں نہیں ہوا کہ مریم علیھا السلام کے پیدا ہوتے ہی یا ان کی کم سنی میں انھیں دین کے خدّام کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔ تاہم، یہ اقدام ان کی شعور کی عمر کے بعد ہی کیا گیا ہو گا۔ اصولی طور پر اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اس پر من و عن عمل کرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی رائے لی، اور بیٹے کی رضامندی کے بعد ہی اقدام کیا۔

دس سے بارہ سال کی وسیع بنیاد تعلیم پانا تعلیمی رجحان رکھنے والے ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ اس کے بعد اس کا خصوصی رجحان دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اسے کس طرح کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ حفظ قرآن کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنا ایک فرد کے اپنے ذوق، صلاحیت اور شعوری انتخاب کا معاملہ ہے، جو شعور کی عمر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

دینی مدارس میں رائج حفظِ قرآن کی کلاس کا طویل دورانیہ جو صبح فجر کے بعد سے نماز عشاء تک، چند وقفوں کے ساتھ جاری رہتا ہے، بچوں پر سخت گراں بار ہوتا ہے۔ اس سرگرمی میں کوئی تنوع نہیں ہوتا کہ بچہ یکسانیت کی بوریت سے نجات پا سکے۔ زبانی یاد کرنے کی ایک ہی سرگرمی اتنے طویل دورانیے تک کرانا، ایک غیر صحت مند طریقہءِ تعلیم ہے۔

کچھے بچوں کو اسکول سے ہٹا کر حفظ کرانے بٹھادیا جاتا ہے۔ حفظ کے بعد انھیں دوبارہ اسکول میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کا حرج کم کرنے اور قرآن کا حفظ جلد مکمل کرانے کی خاطر بچے کا زیادہ سے زیادہ وقت حفظِ قرآن میں لگایا جاتا ہے۔ کھیلنے اور دوستوں اور کزنز کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع انھیں بہت کم ملتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہوتا ہے۔

اس سے بدتر پریکٹس یہ ہے کہ اسکول کے ساتھ حفظ بھی کرایا جاتا ہے۔ یوں بچے والدین کی دوطرفہ خواہشوں کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اپنا بچپن جینے کا پورا موقع ہی نہیں ملتا۔

کم سن بچوں کا زیادہ وقت کھیل کود میں بیتنا چاہیے۔ ایسی ہر تعلیمی سرگرمی جس کے اوقات کھیل کے اوقات سے زیادہ ہوں، بچوں کا استحصال ہے۔ بچپن کی عمر کھیل کھیل میں سیکھنے، خود کھوجنے اور سوالات کرنے کی ہے۔ لاپروائی کی اس حسین عمر کو ایک سخت اور خشک روٹین کی نذر کرنا بچے کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

ایک بار یاد کر لینے کے بعد قرآن مجید کو مستقلاً یاد رکھنا ایک مسلسل محنت طلب کام ہے۔ شعبہءِ حفظ سے منسلک حفاظ کسی حد تک قرآن یاد رکھ پاتے ہیں، مگر عام حفاظ جو عملی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے لیے قرآن مجید کو یاد رکھنا بے حد مشکل رہتا ہے۔ ان کی اکثریت کو بڑی عمر میں پورا قرآن یاد نہیں رہتا۔ ان کا حفظِ قرآن خود ایک یادگار بن کر رہ جاتا ہے۔

ادھر قرآن مجید کے بھلا دینے پر بعض روایات میں وارد ہونے والی وعیدیں قرآن یاد نہ رکھ سکنے والے حفاظ کو احساس جرم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ تاہم، یہ تمام روایات ضعیف ہیں۔[11] قرآن مجید کو بھلانے کا مفہوم یہ ہے اس کے ساتھ تعلق توڑ دی جائے اور اس کے احکامات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

[11] مثلاً درج ذیل روایت دیکھیے:

وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسلم: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوبُ أُمَّتِي فَلَمْ أَرَ ذَنْبًا أَعْظَمَ مِنْ سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ آيَةٍ أُوتِيهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُد (مشكاة المصابيح، 720)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”میری امت کے اعمال کا ثواب مجھ پر پیش کیا گیا، حتیٰ کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے (اس کا ثواب بھی لکھا ہوا تھا)، اور میری امت کے گناہ بھی مجھ پر پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت عطا کی گئی اور اس نے (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیا۔

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے:

رواه الترمذي (2916 و قال: غريب) و أبو داود (461)۔ ابن جريج مدلس ولم يسمع من مطلب شيئًا والمطلب: لم يسمع من سيدنا أنس رضي الله عنه.

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید سے بے اعتنائی برتنا بڑی محرومی کی بات ہے۔ لیکن قرآن کو زبانی یاد رکھنا دین کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

قرآن مجید کے محفوظ ہو جانے کے قابل اعتماد ذرائع میسر آ جانے کے بعد اس کی حفاظت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کی وہ اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ تاہم، اس کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رہ جائے، اس کے

---

https://islamicurdubooks.com/ur/hadith/hadith-.php?bookid=23&hadith_number=720

اس مفہوم کی درج ذیل روایت بھی ضعیف ہے۔

وعن سعد بن عبادة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ما من امرئ يقرا القرآن ثم ينساه إلا لقي الله يوم القيامة اجذم. (رواه ابو داود والدارمي)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص قرآن پڑھتا ہو لیکن پھر وہ اسے بھول جائے تو وہ روز قیامت حالت کوڑھ میں اللہ سے ملاقات کرے گا۔“

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو بھی ضعیف قرار دیا ہے:

يزيد بن أبي زياد:ضعيف وعيسي بن فائد: مجهول،ولم يسمعه من سعد،.بينهما رجل مجهول

https://www.islamicurdubooks.com/hadith/hadith-.php?hadith_number=2200&bookid=23&tarqeem=1

لیے ضروری ہے کہ حفاظ کی ایک بڑی تعداد دنیا میں موجود رہے، جن کی اجتماعی یاداشت میں پورا قران محفوظ رہے۔ قرآن کی حفاظت کا یہ ایسا ذریعہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اپنے ذوق کی تسکین اور عبادت میں حلاوت پانے کے لیے قرآن مجید جزوی طور پر یا مکمل یاد کرنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ مگر یہ سعادت حاصل کرنا ذاتی انتخاب کا معاملہ ہے جو سنِ شعور سے پہلے نہیں کیا جا سکتا۔

دین کے نام پر یا آخرت کے مزعومہ تحفظ کی خاطر بچوں پر ان کی مرضی کے بغیر، ایسی مشقت مسلط کرنا جس کا حکم یا مطالبہ خدا نے نہیں کیا، ان کا استحصال ہے۔ یہ ہرگز ثواب کا کام نہیں۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بچوں کو تختۂ مشق بنانا ان کے ساتھ زیادتی ہے اور خدا کے ہاں ہر ظلم و زیادتی کا حساب لیا جائے گا۔

قرآن کی بے سمجھ تلاوت اور حفظ

صحابہ کرام کے ہاں بے سمجھے قرآن پڑھنے اور یاد کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عربی ان کی اپنی زبان تھی، اس لیے بے سمجھ تلاوت ان کے لیے ممکن نہیں تھی۔ عجمی اقوام جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں، تو پہلی بار ان کے ہاں قرآن کی بے سمجھ تلاوت اور حفظ کا آغاز ہوا۔ متنِ قرآن کی پڑھائی سیکھنا ان کا پہلا کام تھا۔ اس کے بعد انھیں اس کے فہم کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ کسی دوسری زبان کی کتاب پڑھنے میں یہی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔ مگر سستی یا بے توجہی کی وجہ سے ان کی اکثریت نے ناظرہءِ قرآن پر اکتفا کر لیا۔ اس کوتاہی کا عام چلن ہو گیا تو اس کے لیے جواز پیدا کر لیے گیے۔ بے سمجھ حفظ و تلاوت کو اُس حفظ و تلاوت کا مترادف

باور کرادیا گیا جس کی ترغیب احادیث میں وارد ہوئی تھی۔ امام ابو بکر الطرطوشی[12] نے بجاطور پر اس طرز کے حفظ کو بدعت قرار دیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

"ومما ابتدعه الناس في القرآن، الاقتصار على حفظ حروفه دون التفقُّه فيه۔"[13]

"قرآنِ مجید کے متعلق لوگوں کی ایک بدعت قرآن کے فہم و تفقہ کو چھوڑ کر محض اس کے الفاظ کو حفظ کرنے پر اکتفا کرلینا ہے۔"

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں قرآن مجید کو بے سمجھے پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوا ہے:

[12] مالکی فقیہ اور حافظ، المتوفی: 250 ھجری

[13] ابو بكر الطرطوشی، الحوادث والبدع، ناشر: دار ابن الجوزي، الطبعة: الثالثة، 1419 هـ - 1998 م، ص: 101

{كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ} (ص، 38: 29)

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف نازل کی ہے۔ اِس لیے کہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور اِس لیے کہ عقل والے اِس سے یاددہانی حاصل کریں۔

{أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا} [محمد، 47: 24)

سو کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر اُن کے تالے چڑھے ہوئے ہیں؟

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے مروی ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے:

لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلَاث[14]

اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرڈالا۔

[14] ترمذی، رقم:2949، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے
علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے(صحيح وضعيف سنن الترمذي، 2949)

اس روایت کی بنا پر قرآن مجید کو تین دن سے کم میں ختم نہ کرنے کی طرح توڈالی گئی، مگر روایت کا اصل مقصود، یعنی بے سمجھ تلاوت کی حوصلہ شکنی، اسے باور ہی نہیں کیا گیا، بلکہ بے سمجھ تلاوت اور حفظ کو باعث اجر بھی سمجھ لیا گیا!

تلاوت قرآن میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی آیت کو ادھورا نہ پڑھا جائے۔ پڑھتے ہوئے سانس درمیان میں ٹوٹ جائے تو آیت کو کچھ پیچھے سے دہرا کر اسے مکمل کیا جائے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ آیت کا ادھورا مطلب ادا نہ ہو۔ مگر آیت کا مطلب ہے کیا؟ اس کی طرف التفات نہ ہونے کو بھی جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ لیا گیا۔

ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ الف، لام، میم کی تلاوت پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ اس سے بے سمجھ تلاوت وحفظ کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔[15] استدلال یہ ہے

---

[15] مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ، وَالحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، لَا أَقُولُ الم حَرْفٌ، وَلَكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ۔(سنن الترمذي، 2910)

کہ الف، لام۔ میم کا معنی معلوم نہیں، پھر بھی ان کی تلاوت پر ثواب ملتا ہے۔ اس لیے بے سمجھ تلاوت بھی باعثِ اجر ہے۔

اس مفہوم کی تمام روایات میں سے کوئی بھی سنداً صحیح یا حسن کے درجے کی نہیں ہے۔[16] ان کی صحت سے قطع نظر الف-لام-میم، کا ذکر ثواب کا حجم بتانے کے لیے بطور مثال آیا ہے، نہ کہ بے سمجھ تلاوت کی ترغیب دینے کے لیے۔ یہ بات

امام ترمذی نے اس حسن صحیح غریب قرار دیاہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح بتایاہے(صحيح وضعيف سنن الترمذي، 2910)۔ تاہم، اس کی سند پر کلام قابل لحاظ ہے جو آگے آتا ہے۔

[16] یہ مضمون کُل دو صحابہ سے مروی ہے، ایک عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، دوسرے عوف بن مالک الاشجعی۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے محمد بن کعب روایت کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود کا انتقال 33 ہجری میں ہوا اور محمد بن کعب کی پیدایش 38 یا 40 ہجری کی ہے، لہذا دونوں میں لازماً انقطاع ہے اِس لیے اس سند سے منقول ساری روایات ضعیف ہیں۔(التفسير من سنن سعيد بن منصور - محققا (1/ 29)

عوف بن مالک ایک دوسرے صحابی ہیں، اُن سے بھی محمد بن کعب ہی روایت کرتے ہیں، یہاں انقطاع کا مسئلہ نہیں کیونکہ عوف بن مالک کی وفات 73 ہجری میں ہوئی ہے، لیکن اِس سلسلے کی تمام روایات ایک دوسرے راوی، موسی بن عبیدۃ الربذی کے باعث شدید ضعیف ہیں۔ (الذهبی، ديوان الضعفاء، رقم: 4293، ص: 402)۔ مثلاً دیکھیے،مصنف ابن ابی شيبة، رقم: 29933

کسی طرح معقول نہیں کہ کسی بامعنی کتاب کو بے سمجھے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ خصوصاً قرآن مجید جیسی کتابِ ہدایت کے لیے یہ تصور بالکل بے جا ہے۔ پھر یہ ترغیب ان لوگوں کو دی ہی نہیں جا سکتی جن کے لیے قرآن مجید کو بے سمجھے پڑھنا ممکن ہی نہیں تھا کیوں وہ ان کی اپنی زبان میں تھا۔

مُحولہ بالا مفہوم کی ان روایات میں سے بعض متون میں وہ پوری بات بھی بیان ہوئی ہے جو دین اور عقل دونوں کے مطابق ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ اجر محض بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے پر نہیں، بلکہ قرآن مجید پر غور و فکر کرنے، اسے سیکھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے کے مجموعی کام پر بتایا گیا ہے۔

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

تَعلَّمُوا الْقُرْآنَ، وَاتْلُوهُ تُؤْجَروا بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرَ حَسَنَاتٍ، أَمَا إِنِّي لَا أَقُولُ: {الم} وَلَكِنْ أَلِفٌ، وَلَامٌ، وَمِيمٌ۔"[17]

[17] التفسير من سنن سعيد بن منصور– مخرجا، 1/ 35

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن مجید کو سیکھو،
> سمجھو اور اسے پڑھو، تمھیں ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں
> ملیں گی۔ یاد رہے میں یہ نہیں کہتا الم (ایک حرف ہے)،
> بلکہ الف، لام اور میم (الگ الگ حرف) ہیں (یعنی تین
> حروف ہیں)۔"[18]

بعض روایات میں 'حاملِ قرآن' اور 'صاحب قرآن' کے القابات آئے ہیں۔ ان کا مصداق غلط طور پر اس حافظ قرآن کو قرار دے دیا گیا جسے قرآن مجید کے معنی و مفہوم سے کوئی سروکار نہیں۔ اس مفہوم کی روایات بھی ضعیف ہیں، تاہم، ان میں بھی یہ القابات اس شخص کے لیے آئے ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھتا،

[18] مستفاد از تحقیق جناب محمد حسن الیاس، "" قرآن مجید کی تلاوت، ہر لفظ پر دس نیکیاں"
https://www.facebook.com/100064626491667/posts/1889002831463250/

اس پر عمل کرتا، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے، یہ شخص ظاہر ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے والا ہی ہو سکتا ہے۔

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

(مرفوع) حدثنا علي بن حجر، اخبرنا حفص بن سليمان، عن كثير بن زاذان، عن عاصم بن ضمرة، عن علي بن ابي طالب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "«مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَاسْتَظْهَرَهُ»، فَأَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ، أَدْخَلَهُ اللَّهُ بِهِ الْجَنَّةَ[19]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے قرآن پڑھا اور اسے پوری طرح حفظ کر لیا، جس چیز کو قرآن نے حلال ٹھہرایا اسے حلال جانا

[19] امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے اسے ضعیف قرار دیا ہے:
قال ابو عيسى: هذا حديث غريب، لا نعرفه إلا من هذا الوجه، وليس إسناده بصحيح وحفص بن سليمان يضعف في الحديث۔ (ترمذی، رقم: 2905)۔

اور جس چیز کو قرآن نے حرام ٹھہرایا اسے حرام سمجھا تو اللہ اسے اس قرآن کے ذریعہ جنت میں داخل فرمائے گا۔

فہمِ قرآن طبقہءِ علما کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اس کا ایک درجہ تو اعلی سطحی ہے، جو مخصوص علمی ذوق اور فنی مہارتیں رکھنے والی ذہانتوں کا میدان ہے۔ لیکن قرآن مجید کا اصل پیغام اور تعلیم تذکیر و تزکیہ ہے جو بہت سادہ اور واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے کسی اعلی لسانی اور فنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اس دائرے میں ہر شخص قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کر سکتا ہے۔

چنانچہ جہاں لوگوں کو تلاوت قرآن کی ترغیب دی جاتی ہے وہاں انھیں اس کے فہم کی طرف متوجہ کرنا بھی ضروری ہے۔

کمرہءِ جماعت میں طلبا کی عدم دل چسپی کے وجوہات

ہمارا روایتی طریقہءِ تدریس طویل دورانیے کے لیکچرز کے فرسودہ طریقے پر مبنی ہے۔ طلبا کے لیے اتنے طویل دورانیے تک توجہ کا ارتکاز ممکن نہیں ہوتا۔ پہلے وقتوں میں جب عمومی جبری تعلیم کا رواج نہ ہوا تھا، اور تعلیمی رجحان اور دل چسپی رکھنے والے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے، تب طویل لیکچرز پر مبنی طریقہ تدریس مفید نتائج دیتا تھا، مگر موجودہ جبری تعلیم کا نظام ہر بچے کو تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہے، خواہ اسے تعلیم سے دل چسپی ہو یا نہ ہو، اس صورت حال میں یہ غیر دل چسپ اندازِ تدریس بے حد مشکلات پیدا کرنے کا سبب ہے۔

مزید براں، مضمون بھی اگر غیر دلچسپ ہو تو طلبا کی عدم دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی بے زاری کا اظہار کمرہءِ جماعت میں ان کی شرارتوں، نظم وضبط کی کمی، اور استاد کو پڑھانے سے ہٹانے کی کوششوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ

دراصل ان کا احتجاج ہوتا ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں انھیں ڈانٹ ڈپٹ اور سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جدید طریقہ ہائے تدریس میں مختصر دورانیے کے لیکچرز، سمعی اور بصری معاون ذرائع کا استعمال، مطالعاتی اور تجرباتی دورے، عملی سرگرمیاں، استاد اور طلبا کے درمیان اور طلبا کے آپس میں مکالماتی مباحثے اور ان سب سے بڑھ کر ہر طالب علم کے لیے اس کی قابلیت اور رجحانات کے مطابق انفرادی نصاب اور وقت کا تعین، یہ سب پڑھائی میں طلبا کی ذہنی اور جسمانی مشغولیت کو یقینی بنانے کی کوششیں ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی بچہ پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہو پاتا تو وہ یہ دکھا رہا ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی رجحان رکھتا ہی نہیں، اسے رسمی تعلیم کی مشقت نہیں چاہیے۔ ایسے بچوں کو ان کی غیر تعلیمی صلاحیتوں کے مطابق کسی ہنر، کھیل یا کاروبار وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ تعلیمی میدان ایک پیراڈائم شفٹ کا متقاضی ہے، جس میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔

ذہین لیکن سست رو بچے

کچھ بچے ذہین ہونے کے باوجود سست روی سے سیکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سمجھنے اور سیکھنے کے عمل کے دوران میں وہ سوچنے اور تجزیہ کرنے میں بھی مصروف ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ دو عمل ان کے دماغ میں چلتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے سیکھنے کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔

ایسے بچوں کو غبی یا کند ذہن سمجھ لیا جاتا ہے اور وہ بھی دوسروں کے کہنے سے مان لیتے ہیں کہ وہ کم دماغ ہیں۔ یوں ایک باصلاحیت ذہن غلط تشخیص سے ضائع ہو جاتا ہے۔

ان ذہین لیکن سست رو بچوں کی پہچان یہ ہے کہ جب کبھی انھیں اپنی ذہنی رفتار کے ساتھ کچھ سیکھنے اور کرنے کا موقع ملتا ہے تو بہت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اساتذہ اور والدین کو تب حیرت ہوتی ہے کہ ان کی ایسی کارکردگی ہمیشہ کیوں

نہیں رہتی۔ اس کا جواب بچے کے پاس نہیں ہوتا، لیکن والدین اور اساتذہ کے پاس ہونا چاہیے۔

بہت سے ذہین قرار پانے والے افراد اپنے بچپن میں کند ذہن سمجھے جاتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے، جو اوپر بیان ہوئی۔ ان بچوں کو بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ پڑھانا اور سکھانا پڑتا ہے۔ انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی عمل مکمل کر لیں، پھر دوسری بات انھیں بتائی جائے۔ وہ ایک ایک قدم سمجھ کر آگے بڑھتے ہیں، لیکن ایک بار جب وہ کوئی چیز سمجھ لیتے ہیں تو بہترین کارکردگی دکھاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ تعلیم دینا مشکل ہوتا ہے۔ استاد کی مجبوری ہوتی ہے کہ اجتماعی تدریس میں سب کو اوسط رفتار سے لے کر چلے، اس میں یہ بچے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انھیں انفرادی تعلیم اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کم سِن بچوں کو پڑھائی کے لیے راغب کرنا

بچوں کا اپنے اسکول، کتابوں اور پڑھائی سے متعلق ابتدائی تاثر بہت اہم ہوتا ہے۔ وہی یہ طے کرتا ہے پڑھائی سے بچے کی دوستی ہوگی یا نہیں، وہ اس سے کسی درجے میں مَسرّت پائے گا یا اسے جبری مَشقت سمجھ کر جھیلتا رہے گا اور جب موقع ملے گا، گلے سے یہ طوق اتار پھینکے گا۔

ہمارے سماج کی اکثریت کتاب سے گریزاں ہے۔ ایسے ماحول میں بچوں میں لکھنے پڑھنے کی عادت پیدا کرنا والدین کی خصوصی، مستقل اور بہت سمجھ دار توجہ ہی سے ممکن ہے۔ اس معاملے میں سختی کا رویہ اختیار کرنے سے بچے کا تعلیمی سفر شروع ہونے سے پہلے ہی خاتمے کی طرف چل پڑتا ہے۔

کم سن بچوں کو اسکول کے کام کرانے کے لیے انھیں براہ راست کہنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ بچے کی کتابیں اور نوٹ بکس خود لے کر بیٹھ جائیں، اس کی پنسل اور کلر پنسلز سے خود کچھ بنانے اور رنگ بھرنے لگیں۔ اپنی

چیزوں کی ملکیت کا احساس بچے کو ان کی متوجہ کر دے گا۔ وہ خود چلا آئے گا۔ اپنی چیزیں آپ سے لے کر خود کام کرنے لگ جائے گا۔ یہ معمول کم از کم ابتدائی دو سے تین برس جاری رکھنا چاہیے۔ اس طرح بچے کو کام کی عادت پڑ جائے گی۔

سیکھنے کے عمل میں بچوں کی ابتدائی غلطیوں پر بھی ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ کرنے کا اصل کام کوشش ہی ہے۔ اسی سے آگے بڑھنے کی راہ کھلتی ہے۔ بڑے صبر اور سکون سے ان کی غلطیوں کو ان کے سیکھنے کے عمل کا حصہ بنا دینا چاہیے۔

بچہ جس وقت اپنی پسند کی سرگرمی یا کھیل کود میں مصروف ہو اس وقت اسے اسکول کا کام کرنے کا ہرگز نہ کہا جائے، ورنہ اسے یہ تاثر ملتا ہے کہ اسکول کا کام گویا لطف کا رقیب ہے۔ زبردستی کرنے پر بچہ پڑھائی اور کتاب سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ایک آدھ بار کام وقت پر نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسکول سے سرزنش ہو گی تو بچہ اپنے عمل میں خود درستی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسکول والوں کو بھی چاہیے کہ کام کو جبری مشقت نہ بننے دیں۔

ایک اہم اصول لازمی طور پر اپنانا چاہیے وہ یہ کہ بچے کا ہوم ورک کسی صورت میں خود کر کے نہیں دینا چاہیے۔ یہ اس کی شخصیت کی بنیادوں میں بارود بھرنے کے مترادف ہے۔ یہ کام چوری اور بد یانتی کی تربیت ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ دوسروں کی محنت پر ایک طفیلیہ بن کر رہ جائے گا اور ہزار بہانوں سے دوسروں سے کام کروالے گا، مگر خود کام کرنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ بچے نے گھر کا کام نہیں کیا تو اسے اس کے نتائج کا سامنا کرنے دینا چاہیے تا کہ اس میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو۔

دینی مدارس میں رائج حفظِ قرآن کی کلاس کا طویل دورانیہ بچوں پر سخت گراں بار ہوتا ہے۔ اس سرگرمی میں تنوع بھی نہیں ہوتا کہ بچہ یکسانیت کی بوریت سے نجات پاسکے۔ زبانی یاد کرنے کی ایک ہی سرگرمی اتنے طویل دورانیے تک کرتے چلے جانا، ایک غیر صحت مند طریقہءِ تعلیم ہے۔

کچھ بچوں کو اسکول سے ہٹا کر حفظ کرانے بٹھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھیں دوبارہ اسکول میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کا حرج کم کرنے اور قرآن کا حفظ جلد مکمل کرانے کے لیے بچے کا زیادہ سے زیادہ وقت حفظ قرآن میں لگایا جاتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہوتا ہے۔

قاری حضرات کی طرف سے عام طور پر روا رکھی جانے والی سختی اور تشدد بھی بچوں کے لیے سوہانِ روح ہوتا ہے۔ یہ سب قرآن مجید کے ساتھ ان کے تعلق کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ قرآن کے احترام کے باوجود اس کے ساتھ ان کا لگاؤ بری طرح متاثر ہو جاتا ہے۔

والدین اگر اوپر بیان کی گئی ہدایات پر توجہ دیں تو کتاب اور سکول کے کام کے ساتھ بچے کی دوستی ہو سکتی ہے، جو اگلے مراحل میں جب پڑھائی مشکل اور غیر دلچسپ ہونے لگتی ہے، بچے میں اس سے وحشت پیدا نہیں ہونے دیتی۔

گھر میں اگر کتابیں موجود ہوں، گھر والوں کے زیر مطالعہ آتی ہوں تو یہ بچوں کو پڑھائی اور مطالعہ کی طرف راغب کرنے کا بڑا محرک بنتی ہیں۔ لیکن والد صاحب اگر کاروبار یا ملازمت کی مصروفیات سے فراغت ہی نہ پا سکیں اور والدہ دن بھر کی روٹین کے تذکرے کے علاوہ کوئی علمی، ادبی بات نہ کر سکتی ہو، تو بچوں کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنے سے بھی وہ پڑھائی کی طرف مائل نہیں ہو پاتے، سوائے یہ کہ وہ اس کے لیے طبعی رجحان رکھتے ہوں۔ بچوں کو دی ہوئی سہولتیں بچوں کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کا نہیں، اس سے دور کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ والدین، اس معاملے میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی پیسے اور سہولیات دے کر نہیں کر سکتے، یہ فقط الزام دھرنے کے کام آتی ہیں۔

تعلیم کسی اور کی فرمائش پر حاصل کرنا ایک تکلف اور تکلیف دہ کام ہے۔ یہ کام اپنی مرضی سے ہو تب ہی نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ بچے میں پڑھائی اور کتاب سے دوستی پیدا کرنے کے لیے ان کے ساتھ تعلق کا ابتدائی تاثر خوش گوار ہونا چاہیے۔ اگر بچے

میں تعلیمی رجحان ہے تو یہ تاثر حصول تعلیم کے لیے مہمیز کا کام دے گا اور تعلیمی رجحان اگر کم ہے تو بھی یہ ایک حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ریکارڈ توڑنا منع ہے!

ریکارڈ ٹوٹنے کے لیے بنتے ہیں۔ ہر ریکارڈ مشکل اور محنت کی سطح ایک درجہ مزید بلند کر دیتا اور چیلنج دیتا ہے کہ اب توڑ کر دکھاؤ؛ اور ہر بار کوئی عالی حوصلہ آگے بڑھ کر اسے شکست دیتا اور ایک نیا ریکارڈ کھڑا کر دیتا ہے۔ علوم و فنون کی ساری ترقی چیلنج قبول کرنے اور اگلوں سے بڑھ کر کچھ کر دکھانے کے جتن اور حوصلے کی مرہونِ منت ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں نت نئی ذہانتوں اور ہر آن بلند ہوتے حوصلوں کا ایک سلسلہ ہے جو کہیں رکتا نظر نہیں آتا۔ یہ گویا "کلّ یوم ھو فی شان"[20] کا مظہرِ خداوندی ہے۔

ریکارڈ ایک بار بننے کے بعد اگر نہ ٹوٹتے تو علم و فن کے کسی شعبے میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہتی۔ حوصلے پست اور لوگ بور ہو جاتے۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جس کے

[20] ہر آن وہ ایک نئی شان میں ہے۔

بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہاں ایک بار بننے کے بعد ریکارڈ توڑنا منع ہے۔ یہ علومِ دینیہ کا شعبہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جو علمی ریکارڈ اگلوں نے قائم کر دیے، وہ اب قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتے۔ نئی نسل کے حوصلوں کو پرواز سے پہلے ہی حدِّ پرواز بتا دی جاتی ہے کہ اس سے آگے بڑھے تو پر جل جائیں گے!

وہ خدا جو زندگی کے ہر شعبے کو ایک سے ایک برتر ذہانت اور صلاحیت عطا کرتا چلا جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ اپنے دین کے لیے اس سخاوت پر آمادہ نہیں۔ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو بڑے لوگ اتفاقاً پہلے پیدا ہو گئے وہ علم، ذہانت اور قابلیت ہی میں نہیں بلکہ تقوی میں بھی اتنے برتر تھے کہ ان کے معیار کو چھونے کا تصور بھی مُحال ہے۔ اب طالبِ علم کا کام اگلوں کی عبارات کی نقول پیش کرنا اور ان کی حاشیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔

اس خود ساختہ محصوری میں کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کی عنایات کا فیضان آج بھی جاری ہے، ضرورت فقط اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنے کی ہے۔ ذرائعِ علم

میں جو حیرت انگیز سہولتیں اس دور میں پیدا ہو گئی ہیں، اس کے بعد تو یہ بالکل ممکن ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو اگلوں سے آگے بڑھ جائیں۔

تشدد پسندی کی تعلیم

ہمارے سماج میں بچوں کو ان کی اصلاح کی خاطر مارنا پیٹنا والدین اور اساتذہ کا جائز حق مانا جاتا ہے۔ یہ تشدد برائے اصلاح کے جواز کا بیانیہ ہے۔ اس سے تشدد پسندی نفسیات کا حصہ بنتی اور مسائل کو بزورِ طاقت حل کرنے کی خُو پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کو نظم و ضبط، اخلاق و آداب اور ضروری مہارتیں سکھانے کے لیے کچھ سختی کرنی پڑ جاتی ہے، لیکن اس کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ شفیق والدین اور اساتذہ کی تنبیہ اور ناراضی ہی بچے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

بچوں کی تربیت کے لیے ان پر تشدد کا مذہبی جواز نبی کریم ﷺ سے منسوب ایک روایت سے بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بچہ دس سال کا ہو جائے تو اسے نماز نہ پڑھنے پر مارا جائے۔ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔[21] یہ

[21] اِس مضمون کی روایت یوں ہے:

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين، واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين، وفرقوا بينهم في المضاجع''.(**سنن ابو داوٗد**، رقم ۴۹۵)

''عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو، اور ان کے سونے کے بستر الگ کر دو۔''

ذخیرۂ حدیث میں یہ روایت صرف دو صحابہ سے منقول ہے:

۱۔ سبرہ بن معبد الجہنی۔

۲۔ عبد اللہ بن عمرو۔

پہلے صحابی، سبرہ بن معبد الجہنی سے منقول تمام روایات، ایک ضعیف راوی عبد الملک بن الربیع الجہنی کی وجہ سے ضعیف ہیں۔

دوسرے صحابی عبد اللہ بن عمرو کی نسبت سے منقول روایت منقطع ہے۔ یہ سب سے پہلے ''المدونۃ الکبریٰ''، امام مالک میں نقل ہوئی ہے۔(۱/ ۱۳۲) یہ روایت ''ابن وھب'' بیان کرتے ہیں جن کی پیدایش ۱۲۵ھ کی ہے، جب کہ جن صحابہ سے وہ نقل کر رہے ہیں، اُن دونوں کا انتقال ۶۵ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔ یعنی ان کی ملاقات ثابت نہیں۔ امام مالک نے اِس روایت کے علم میں ہونے کے باوجود خود بھی اسے اپنی ''موطا'' کا حصہ نہیں بنایا۔

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سب سے پہلے حدیث کی جس کتاب میں سامنے آئی، وہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' ہے۔ ان تمام روایات میں 'سَوَّار بن داوٗد' موجود ہیں جن کے بارے میں متعدد علماے جرح و تعدیل مطمئن نہیں ہیں۔ مثلاً حافظ ذہبی نے ان پر ''ضعف'' کا حکم لگایا ہے۔ اسی طرح

''تقریب التہذیب'' کے مصنف کی رائے میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ان کے بقول یہ روای ضعیف ہے مگر اس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس کی رائے کو سوائے احمد بن حنبل کے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔: 'ضعيف يعتبر به، ولم يحسن الرأي فيه سوى أحمد'

لہٰذا تنہا صرف اسی ایک راوی کی بنا پر عبد اللہ بن عمرو سے مروی اس سلسلے کی تمام روایات ''ضعیف'' قرار دی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاصر علمائے حدیث نے بھی اس روایت کو سنداً قبول نہیں کیا۔

نیز، روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ ''عمرو بن شعیب'' اپنے والد کی نسبت سے خود اپنے ہی دادا سے روایت کر رہے ہیں یا اُن کے والد اپنے دادا سے روایت کر رہے ہیں (عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده)۔ پہلی صورت ہے تو روایت میں ارسال ہو گا اور دوسری ہے تو انقطاع ہو گا۔

ابن ابی شیبہ نے اِس پوری بات کو ایک تابعی کے قول کے طور پر الگ سے بھی نقل کیا ہے، جس سے اِس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سرے سے حدیث تھی ہی نہیں، بلکہ ایک تابعی کا قول تھا۔ چنانچہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں ہے:

حدثنا وكيع، عن سفيان، عن أبي رجاء، عن مكحول، قال: ''يؤمر الصبي بها إذا بلغ السبع ويضرب عليها إذا بلغ عشرا''. (رقم ۳۴۰۲)

''وکیع کہتے ہیں کہ سفیان نے ابی رجا سے اور انھوں نے مکحول سے سنا کہ جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو۔''

(ملخص از تحقیق جناب محمد حسن الیاس، "بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر مارنا" ماہنامہ اشراق، اگست، 2021۔

غالباً کسی صحابی کا اثر یا تابعی کی اجتہادی رائے تھی، جو حدیث کی صورت میں نقل ہو گئی۔ امام شوکانی نے اپنی کتاب "نیل الاوطار" میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک کاغذ پر لکھی ہوئی ملی تھی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے بغیر ہی کسی شخص کے الفاظ لکھے تھے کہ اس کے بقول بچے کو نماز نہ پڑھنے پر غالباً نو سال کی عمر میں مارا جا سکتا ہے۔ روایت یہ ہے:

عن عبيد الله بن أبي رافع، عن أبيه رضي الله عنه، قال: وَجَدْنَا صَحِيفَةً فِي قِرابِ سَيْفِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ وَفَاتِهِ، فِيهَا مَكْتُوبٌ: "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمنِ الرَّحِيمِ، فَرِقُوا بَيْنَ مَضَاجِعِ الْغِلْمَانِ

---

https://www.javedahmedghamidi.info/#!/ishraq/60ffb900404eb9173b50147e?articleId=60ffca6b404eb9173b5014ca&decade=2020&year=2023

وَالْجَوَارِي، وَالْأَخَوَاتِ لِسَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوا أَبْنَاءَكُمْ عَلَى الصَّلاةِ إِذَا بَلَغُوا -أَظُنُّهُ- تِسَعًا ''.(رقم ۳۳۳۲)

''عبید اللہ بن ابی رافع اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تلوار کے پاس ایک کاغذ لکھا ملا تھا جس پر لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بہن بھائیوں کے بستر سات سال کی عمر میں الگ کر دو اور بچوں کو میرے خیال کے مطابق نو سال کی عمر میں نماز ادا نہ کرنے پر مارو۔''

یہی وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم نے اپنے انتخاب میں اس حدیث کو قبول نہیں کیا۔[22]

"یہ روایت علم و عقل کے مسلّمات اور دین کے مجموعی مزاج سے بھی بظاہر متصادم نظر آتی ہے۔ جب شریعت میں نماز کا مکلف ہی بالغ فرد ہے تو دس سال کی عمر میں

[22] (مستفاد از تحقیق جناب محمد حسن الیاس، "بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر مارنا" ماہنامہ اشراق، اگست، 2021)

نماز ادانہ کرنے پر مارنا ناقابل فہم ہے۔اِس کے ساتھ ساتھ نفسیات کے ماہرین بھی یہ بتاسکتے ہیں کہ بچپن کی یہ سختی کیسے انسانوں کے مزاج اور مذہب سے تعلق پر اثر انداز ہوتی ہے، جب کہ دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی کریم النفس شخصیت، جنھوں نے پوری زندگی دین کو نرمی، ملائمت اور استدلال سے سمجھایا، وہ کیسے علی الاطلاق ایسی ہدایت کر سکتے ہیں جو جسمانی مار، نفسیاتی دباؤ اور عبادت جیسے شعوری عمل کو زبردستی ادا کرانے کی ترغیب بن جائے۔"[23]

تشدد پسندی جاگیر دارانہ کلچر کا خاصہ ہے۔ رعایا کو زیرِ نگیں رکھنے کے لیے ان پر تشدد کے مظاہرے ایک لازمی عنصر کے طور پر اس کلچر کا حصہ چلے آئے ہیں۔ ہماری علاقائی زبانوں میں موجود محاورے اور ضرب الامثال بھی تشدد پسندی کی عکاسی کرتے ہیں۔ بابا بلھے شاہ سے منسوب یہ اشعار یہی بیان کرتے ہیں:

چار کتاباں اتوں لتھیاں، اتوں لتھا ڈنڈا

---

[23] حوالہ سابق

چار کتاباں کج نہ کیتا، سب کج کیتا ڈنڈا

(چار الہامی کتابیں اوپر سے نازل ہوئیں اور ڈنڈا بھی اوپر سے نازل ہوا۔ چاروں کتابوں سے کچھ نہ ہوا، جو کچھ ہوا ڈنڈے سے ہوا۔)

تشدد پسندی کے مظاہر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ والدین کا استاد سے یہ کہنا کہ "بچے کی ہڈیاں ہماری اور گوشت آپ کا" یعنی بچے کی ہڈیاں نہ ٹوٹیں، باقی کھال پر جتنی چاہیں مشق ستم کی جاسکتی ہے، تشدد کو جواز فراہم کرتا ہے۔ لوگ فخر سے بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں انھوں نے والدین اور اساتذہ سے کتنی مار کھائی۔ جسمانی سزائیں یہاں آخری چارۂ کار کے طور پر نہیں، بلکہ ترجیحاً اختیار کی جاتی ہیں۔

تشدد سے تربیت پانے والے بچوں میں ڈر، عدم تحفظ، منافقت، جھوٹ، بدیانتی، بزدلی، بدتمیزی، تشدد پسندی اور طاقت کے بل پر مفادات اور مقاصد کے حصول کی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سماج کی ناقابلِ رشک اخلاقی حالت اور بزورِ

طاقت مسائل حل کرنے کی نفسیات کے پیچھے تشدد برائے اصلاح کے تصور کا گہرا عمل دخل ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد یہ یقین رکھتی ہے کہ ملک میں مثبت تبدیلی لانے کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ کرپٹ سیاست دانوں کو پھانسی چڑھا کر یا گولی مار کر تعمیرِ نو کی بنیادیں رکھی جائیں۔ آمریت پسند ملک کے مسائل کا حل ایک مطلق العنان حکمران کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کے آہنی ہاتھ سخت سزاؤں کے ذریعے سے آناً فاناً حالات کی کایا پلٹ دیں۔ اپنے مطالبات منوانے کے لیے سرکاری اور نجی املاک کی توڑ پھوڑ کرنا اور سیاسی انتخابات کے دوران میں ہونے والے پر لڑائی جھگڑے سب تشدد پسندی کے مظاہر ہیں۔

طب کا شعبہ بھی اس بہیمانہ نفسیات سے محفوظ نہیں۔ ڈاکٹر حضرات اپنی ہڑتالوں میں مریضوں کی جانوں کو یرغمال بنا کر اپنے مانگیں پوری کروانا درست سمجھتے ہیں۔ وکلا جتھا بندی کر کے مخالفین پر حملے اور تشدد پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ پولیس زیرِ حراست ملزمان پر تشدد روا سمجھتی ہے۔ ریاستی ادرے اختلافی آوازوں کا گلا

گھونٹنے کے لیے طاقت کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ سیاسی اور مذہبی جتھے سڑکیں بند کر کے لوگوں کے روزگار بلکہ ان کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر مطالبات منوانا درست گردانتے ہیں۔ لوگوں کو اپنی طے کردہ مذہبی اور نظریاتی حدود میں رہنے کا پابند کرنے کے لیے ڈرانا دھمکانا، مارنا پیٹنا مذہبی اور قومی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ توہین مذہب کے محض الزام پر ملزم کو قتل کرنے کے درپے لوگ اسی نفسیات کا اظہار کرتے ہیں۔

فرد اور سماج میں حقیقی تبدیلی کن عوامل کے تحت آتی ہے اور اس میں کتنا وقت لگتا ہے، تشدد پسند ذہنیت اس نفسیاتی اور سماجی سائنس سے نابلد ہوتی ہے۔ جس تبدیلی کا خمیر طاقت کے استعمال اور تخریب پر رکھا جائے اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں، تاریخ کے المناک تجربات سے یہ ذہنیت واقف نہیں۔

ڈر اور خوف سے اختیار کی گئی تبدیلی منفی، غیر مستحکم اور بد دیانت ہوتی ہے۔ یہ منافرت اور خانہ جنگی پر منتج ہوتی ہے۔ وہی تبدیلی دیرپا ہوتی ہے جس کے لیے

انسانی شعور کو مخاطب کیا جائے، علم و استدلال سے اسے پیش کی جائے اور اس میں وقت لگتا ہے۔

بچوں کے رویوں میں مثبت کردار پیدا کرنے اور منفی عادات کی روک تھام کے لیے والدین اور اساتذہ کے ذاتی کردار اور اچھے ماحول کی دستیابی سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہوتی۔ بچوں پر تشدد ایک بھیانک عمل ہے جس کے نتائج فرد اور خاندان سمیت پورا سماج بھگتتا ہے۔

بچوں پر تشدد کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ قانون بھی اپنا کردار ادا کرے۔ اس کے لیے پہلے تشدد پسند پولیس کی درست خطوط پر تربیت کی ضرورت ہے۔

بچوں کے ادب میں تشدد پسندی

ہمٹی ڈمٹی کا دیوار سے گر کر ٹوٹ جانا اور جڑ نہ سکنا، ایک سانحہ ہے مگر اس سے لطف اندوز ہونا تشدد پسندی ہے۔ صوفی غلام مصطفی تبسم کی شہرہءِ آفاق نظموں کے مجموعے "جھولنے" کی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں:

چیونٹی کا سر پھوڑ دو

چلاّئے تو چھوڑ دو

سانپ کی دم مروڑ دو

چلاّئے تو چھوڑ دو

یہ بے حسی اور سفاکیت کی وہی تعلیم ہے جو ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ اونٹ اور گیدڑ کی کہانی میں گیدڑ سے بدلہ لینے کے لیے اونٹ کا اسے دریا میں ڈبو کر مار ڈالنا، برائی کے بدلے میں اس سے زیادہ برائی کرنے کا سبق ہے۔ روبن ہڈ کی کہانی میں امیروں سے ان کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کرنے کو ہیرو ازم سمجھنا نیک نیتی

کی بنیاد پر قانون شکنی کی تعلیم ہے۔ اس سے دولت مند سے محض اس کی دولت کی وجہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے اس سے اس کی دولت چھین لینے کی خواہش کے پیچھے یہی نفرت کارفرما ہوتی ہے جو سماجی اور سیاسی تحریکوں اور حکومت کی پالیسیوں تک میں نظر آتی ہے۔ کسی پولیس والے یا کسی اینگری ینگ مین کا ماورائے قانون انصاف حاصل کرنے کے خیال پر مبنی ناولوں اور فلموں سے طاقت کے بل پر مسائل کو حل کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ درحقیقت یہ فساد فی الارض کی تعلیم ہے۔ اس سے متاثر اذہان کسی شدت پسند کے ایک بلاوے پر سماج میں آگ لگا دیتے ہیں اور پھر خود کو نجات دہندہ بھی سمجھتے ہیں۔

بچوں کے ادب میں یہ منفی تعلیم غیر محسوس انداز سے بچوں کے ذہن کا حصہ بنتی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بد نما رویوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ مخبوط الحواس لوگوں کو چھیڑنا، سوئے ہوئے کتے کو پتھر مارنا، پنجرے میں قید

جانوروں اور پرندوں کو ستانا، کیڑے مکوڑوں کو بلا وجہ کچل دینا، لوگوں پر دھونس جما کر لطف اٹھانا، اپنا ایجنڈا بزور طاقت لوگوں پر نافذ کرنا، یہ سب رویے ماحول کے اثرات کے علاوہ ایسی تعلیمات سے بھی جواز پاتے ہیں جو کہانیوں اور مثالوں کی شکل میں بچوں کے شعور یالاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔

مذہبی حوالے سے انبیائے کرام کے بعض واقعات اگر اپنے پورے تناظر میں رکھ کر نہ بتائے جائیں تو بچوں میں مذہبی جواز کے ساتھ متشدد رویے پیدا کر سکتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے معبد میں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا کعبے میں بتوں کو توڑنا، جس سے بت شکنی کا جواز پا کر مندروں اور آثار قدیمہ میں اور پبلک مقامات پر لگے مجسموں کو توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہءِ یمن کو اس کی طرف سے کسی اشتعال انگیزی سے پہلے ہی اپنی اطاعت پر مجبور کرنا غیر مسلموں کو محکوم بنانے کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ان واقعات کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کا پورا موقف معلوم کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ ان کے شرک کے خلاف مسلسل مکالمے میں مصروف تھے۔ پھر ایک موقع پر انھوں نے اپنے والد کے معبد میں موجود بتوں کو توڑا تھا نہ کہ کسی باہر کے بت خانے کو۔ اس کا مقصد بت شکنی نہیں، بلکہ یہ استدلال پیش کرنا تھا کہ جن بتوں کے بارے میں لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ ان کی سنتے اور ان کو نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں وہ محض پتھر کے بہرے گونگے مجسمے ہیں۔ یہ وطیرہ نہ تھا کہ جہاں بت دیکھا، اسے توڑ دیا۔

کعبے کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام نے خدائے واحد کی عبادت کے لیے اس کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔ اہل عرب اس کی اس تاریخ سے واقف تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے تجاوز کرتے ہوئے ہمسایہ مشرک قوموں کی نقالی میں کعبے میں بت رکھ کر ان کی عبادت شروع کر رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کئی برس ان کو

انھیں کے مانے ہوئے حقائق کے تقاضے باور کرانے کی کوشش کی تھی۔ بالآخر جب آپ کے پاس طاقت آگئی تو آپ نے کعبے کو بتوں سے واگزار کرالیا۔

انبیا کے ان اقدامات سے اس بات کا کوئی جواز پید نہیں ہوتا کہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے یا انھیں مسجد میں تبدیل کرنا کوئی قابل تحسین کام ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّهُدِّمَتۡ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٞ وَصَلَوَٰتٞ وَمَسَٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيهَا ٱسۡمُ ٱللَّهِ كَثِيرٗاۗ [الحج، 22: 40]

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور گرجے اور کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھائے جا چکے ہوتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ یمن کا معاملہ یہ تھا کہ اللہ تعالی نے فلسطین کا علاقہ اپنی توحید کے مرکز کے طور پر مختص کر کے بنی اسرائیل کو اس کا نگران مقرر کیا تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہمسایہ ریاستوں کو زیر

نگین کر لیں۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ خطے میں جس طاقت کو موقع ملتا وہ دوسرے علاقوں پر تاخت کرتی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ بنی اسرائیل ہمسایہ ریاستوں کو اپنے زیر نگین کر لیں اس سے پہلے کہ وہ ان پر حملہ کریں۔

صحابہ ءِ کرام نے بھی اسی بنیاد پر مکہ اور حجاز کے مرکزِ توحید کے نگران بنائے جانے کے بعد ہمسایہ ریاستوں پر داروگیر کی تھی۔

اُن خصوصی معاملات کا دور جدید میں غیر مسلم ریاستوں پر مسلمانوں کے بلاجواز قبضے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

غیر مسلموں سے عام معاشرتی تعلقات استوار کرنے کے بارے میں بھی ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مشن کے خلاف برسرپیکار عرب کے مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ اپنی پرانی دوستی برقرار رکھیں، مبادا دین اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچے۔ مسلم افراد کے ان غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات قبل از

اسلام چلے آئے تھے۔ ان تعلقات کو ختم کرنے کا حکم اس وقت ہی دیا گیا جب وہ لوگ سخت دشمنی پر اتر آئے۔ اس معاملے کا عام غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اسلام سے کوئی مخاصمت نہیں رکھتے۔

بچوں کے ادب میں موجود منفی مواد کے اخراج اور مذہبی حوالوں سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسکولوں میں تفریح کے اوقات کی بندش

اسکولوں میں جب سے طلبا کو جسمانی سزا دینے پر پابندی عائد کی گئی ہے ان کی تنبیہ و تادیب کے لیے متبادل طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، جن میں کچھ مناسب ہیں، لیکن کچھ جسمانی سزا سے بھی زیادہ مضر نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک طلبا کی تفریح کے اوقات(Break Time)کی بندش ہے۔

تفریح کا مختصر دورانیہ بچوں کا محبوب ترین وقت ہوتا ہے۔ پے در پے اسباق کی تدریس سے تھکے اذہان کے لیے نصف یا پون گھنٹے کی تفریح بڑی غنیمت ہوتی ہے۔اس دوران میں کچھ کھیل کود کر وہ آنے والے اسباق کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے تعامل، مسابقت، تصادم، دوستی اور دشمنی وغیرہ کے غیر نصابی اسباق سیکھتے ہیں، جو ان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ وقت ان کی جسمانی توانائی کا درست مصرف ہوتا ہے۔

اس قیمتی وقت کی بطورِ سزا بندش ناقابلِ تلافی نقصان ہے، جو طالب علم کی کسی بھی کوتاہی یا قصور کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً کم سن بچوں کے لیے تو یہ سزا انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔ بچوں کی اس کم زوری کی بنا پر انھیں مجبور کرنا بلیک میلنگ ہے، چاہے اس کا مقصد مثبت ہو مگر طریقہ منفی ہے۔

کھیل بچوں کے لیے عبادت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بچے کو اس کی عبادت سے روک دے۔ تفریح کی بندش سے بچے میں جو پژمردگی پیدا ہوتی ہے وہ تفریح کے بعد کے اسباق کے لیے اس کی ذہنی حاضری اور سیکھنے کی سکت کو بھی متاثر کر دیتی ہے اور مزید تعلیمی نقصان کا باعث بنتی ہے۔

تادیب و تنبیہ کے لیے کوئی بھی معقول اور موثر طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے مگر تفریح کے اوقات کی بندش کسی صورت قابل قبول نہیں۔

فنونِ لطیفہ کی تدریس میں کوتاہی

فنونِ لطیفہ خدا کی صفتِ جمال اور انسانوں کی حسِ جمالیات کے اظہاریے ہیں۔ اہلِ فن زندگی میں حسن کی نمو کرتے اور لطیف احساسات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں جس سے متوازن اور صحت مند نفسیات اجاگر ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات اور زندگی کا شعور لطیف احساسات کا مرہونِ منت ہے۔ ان فنون سے اجتناب مزاجوں میں کھردراہٹ اور سطحیت پیدا کر دیتا ہے، جس سے وحشت اور جہالت پرورش پاتے ہیں۔ حسن سے نفرت، خدا کی نعمتوں کی ناقدری اور احساسِ جمال کی توہین ہے۔

فنونِ لطیفہ خدا کی پیدا کردہ زینتیں ہیں۔ زینت بذات خود بری نہیں ہوتی، اس کا اچھا یا برا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اس نے دنیا کی زینتیں اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، تو کون ہے جو انھیں حرام ٹھیرائے؟ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ} [الاعراف، 7: 32]

اِن سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھیرایا ہے؟ اِن سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں کوئی حصہ نہ ہو گا)۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔

احادیثِ رسول میں جہاں کہیں موسیقی یا مصوری وغیرہ کی برائی بیان کی گئی ہے وہ ان کے برے استعمال کی مذمت مقصود ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی روایات میں صراحت ہے کہ شادی یا عام تفریح کے مواقع پر آپؐ کے سامنے موسیقی اور رقص پیش ہوا اور آپ نے منع نہیں فرمایا بلکہ اس کی ترغیب بھی دی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدِي جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ بِغِنَاءِ بُعَاثَ، فَاضْطَجَعَ عَلَى الفِرَاشِ، وَحَوَّلَ وَجْهَهُ، وَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ، فَانْتَهَرَنِي وَقَالَ: مِزْمَارَةُ الشَّيْطَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَقْبَلَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلاَمُ فَقَالَ: «دَعْهُمَا»، فَلَمَّا غَفَلَ غَمَزْتُهُمَا فَخَرَجَتَا (بخاری، رقم:949)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے۔ اس موقع پر دو (گانے والی) لونڈیاں جنگ بُعاث کے گیت گا رہی تھیں۔ آپ بستر پر دراز ہو گئے اور اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔ (اسی اثنا میں) حضرت ابو بکر گھر میں داخل ہوئے۔ (گانے والیوں کو دیکھ کر) انھوں نے مجھے سرزنش کی اور کہا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شیطانی ساز (کیوں)؟" (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے اور فرمایا: انھیں (گانا بجانا) کرنے دو۔ پھر جب حضرت ابو بکر دوسرے کام میں مشغول ہو گئے تو میں نے ان (گانے والیوں کو چلے جانے کا) اشارہ کیا تو وہ چلی گئیں۔ یہ عید کا دن تھا۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كَانَ فِي حِجْرِي جَارِيَةٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَزَوَّجْتُهَا، قَالَتْ فَدَخَلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عُرْسِهَا، فَلَمْ يَسْمَعْ غِنَاءً وَلَا لَعِبًا، فَقَالَ: "يَا عَائِشَةُ هَلْ غَنَّيْتُمْ عَلَيْهَا أَوَ لَا تُغَنُّونَ

عَلَيْهَا"؟ ثُمَّ قَالَ: "إِنَّ هذا الحي من الأنصار يحبون الغناء" (صحیح ابن حبان، رقم:5875)

میرے زیر کفالت ایک انصاری لڑکی رہتی تھی۔ میں نے اس کی شادی کر دی۔ شادی کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے۔ اس موقع پر آپ نے نہ کوئی گیت سنا اور نہ کوئی کھیل دیکھا۔ (یہ صورت حال دیکھ کر) آپؐ نے فرمایا: "عائشہ، کیا تم لوگوں نے اسے گانا سنایا ہے یا نہیں؟" پھر فرمایا: یہ انصار کا قبیلہ ہے جو گانا پسند کرتے ہیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا وَصَوْتَ صِبْيَانٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا حَبَشِيَّةٌ تَزْفِنُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهَا، فَقَالَ: يَا عَائِشَةُ تَعَالَيْ فَانْظُرِي. فَجِئْتُ فَوَضَعْتُ لَحْيَيَّ عَلَى مَنْكِبِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَيْهَا مَا بَيْنَ الْمَنْكِبِ إِلَى رَأْسِهِ، فَقَالَ لِي: أَمَا شَبِعْتِ، أَمَا شَبِعْتِ. قَالَتْ: فَجَعَلْتُ أَقُولُ لاَ لأَنْظُرَ مَنْزِلَتِي عِنْدَهُ إِذْ طَلَعَ عُمَرُ، قَالَتْ: فَارْفَضَّ النَّاسُ عَنْهَا: قَالَتْ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي لأَنْظُرُ إِلَى شَيَاطِينِ الإِنْسِ وَالجِنِّ قَدْ فَرُّوا مِنْ عُمَرَ. (ترمذی، رقم:3691)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہمارے درمیان) تشریف فرما تھے۔ یک بہ یک ہم نے بچوں کا شور سنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے۔ پھر (ہم نے دیکھا کہ) ایک حبشی عورت ناچ رہی تھی۔ بچے اس کے ارد گرد موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "عائشہ، آ کر دیکھو۔" (آپ کہتی ہیں کہ) میں آئی اور اپنی ٹھوڑی حضور کے شانے پر رکھ کر آپ کے کندھے اور سر کے مابین خلا میں سے اسے دیکھنے لگی۔ حضور نے کئی بار پوچھا: "کیا ابھی جی نہیں بھرا؟" میں یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ کو میری خاطر کس قدر مقصود ہے، ہر بار کہتی رہی کہ ابھی نہیں۔ اسی اثنا میں عمر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ (انھیں دیکھتے ہی) لوگ منتشر ہوگئے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر کے آنے سے شیاطین جن وانس بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں اس طرح کے معاملات کے بارے میں بھی جو سختی پائی جاتی تھی، اس وجہ سے لوگ ان کے سامنے ایسے جائز کام کرنے سے بھی کتراتے تھے۔ ان کے جواز کے لیے اتنا کافی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس پر نکیر نہیں کی بلکہ اپنے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کو بھی یہ سب دکھایا۔

یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کسی حرام شے کو کسی وقت یا کسی مقدار میں جائز قرار دے دیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ممانعت ان چیزوں کے صرف برے استعمال

کی ہے۔ یہی معاملہ مصوری کا ہے۔ آپؐ نے جن تصاویر کی مذمت کی ان میں شرک یا نمود و نمایش کا عنصر پایا جاتا تھا۔

ہمارے تعلیمی نصابات میں فنونِ لطیفہ کی تدریس کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاتا۔ اسکولوں میں مصوّری، موسیقی اور رقص جیسے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جن اسکولوں میں یہ مضامین شاملِ نصاب ہیں وہاں ان کے لیے باقاعدہ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ اساتذہ بھرتی کرنے کا اہتمام دکھائی نہیں دیتا۔

بزمِ ادب کے پروگرام بھی اب شاذ ہی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ادب و شاعری سے لگاؤ تو ایک طرف، اس کا ذوق اور فہم بھی اب خال خال نظر آتا ہے۔ بچوں میں فنونِ لطیفہ کا طبعی رجحان اگر نظر آئے بھی تو اسے تفریحِ اوقات یا تضییعِ اوقات کے قبیل کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ان فنون کی پیشہ ورانہ تعلیم کی حوصلہ افزائی بھی عموماً نہیں کی جاتی۔

دنیا محض سائنس دانوں اور سماجی علوم کے ماہرین سے نہیں چلتی، اس میں بہت کچھ حسن اور رعنائی فنونِ لطیفہ کی مرہون منت ہے۔ جن بچوں کو فطرت نے شاعر، ادیب، موسیقار، اور مصوّر بننے کے لیے پیدا کیا ہے، انھیں اپنے طبعی رجحان کو پروان چڑھانے کا موقع نہ دینا، بچے کے ساتھ تو ناانصافی ہے ہی، خدا کی سکیم کی خلاف ورزی بھی ہے، جو دنیا میں مختلف طبائع کی رنگارنگی دکھانے کے لیے انھیں اتنا مختلف پیدا کرتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے ادب و شاعری کا فہم اور ذوق حاصل کرنا یوں بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید جو زبان و ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، اس کی تفہیم اور اس کا حظ اسی وقت تک نصیب ہو سکتا ہے جب زبان و ادب کا اچھا ذوق حاصل کر لیا گیا ہو۔ اس کے ترجمے کی مدد ہی سے سہی، ایک ادب پارے کا فہم اور لطف کسی درجے میں تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب اچھا ادبی ذوق موجود ہو۔

فنونِ لطیفہ اور زبان و بیان کی لطافتوں سے نا آشنائی کی وجہ سے انسانی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ انسانوں اور زندگی کو گہرائی سے سمجھنے کی بصیرت متاثر ہوتی ہے۔ کسی درجے میں یہ بصیرت ہو بھی تو اظہار کے لیے مناسب الفاظ اور اسلوب نہیں ملتے۔ ایسے لوگ کچھ کہتے ہوئے ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کے تاثرات سے بہت کام لیتے ہیں۔ یہ جھگڑے نہیں سلجھا سکتے، جہاں مکالمہ کرنا ہو وہاں الجھنے لگتے ہیں، یہ جلد ناراض ہو جاتے ہیں، انھیں لوگوں کو منانا بھی نہیں آتا۔ نتیجتاً یہ سطحیت کا شکار ہو اپنے کم تر ذہنی شاکلے پر اکتفا کرنے پر مجبور اور پھر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں اور چرب زبان انھیں آسانی سے بے وقوف بھی بنا لیتے ہیں۔

نظم وضبط اور ٹیلنٹ کی کشمکش

نظم وضبط ایک بہتر زندگی کے لیے ضروری، اس میں حسن کا باعث اور کامیابی کی ضمانت ہے، مگر اس کی بے لچک پابندی زندگی کو زندان بنا کر رکھ دیتی ہے، جہاں فکر اور تخلیق گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ اصول و قوانین انسانوں کی خدمت اور سہولت کے لیے وضع کیے جاتے ہیں، نہ کہ ان کا غلام بنانے کے لیے۔ چنانچہ جہاں کہیں یہ ان کے کسی نقصان کا باعث بنیں، انھیں تبدیل یا معطل کر دینا چاہیے، یا ان میں گنجایش پیدا کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا وتیرہ یہی ہے۔ وہ چاہتا تو انسانوں پر لازم قرار دیتا کہ جو حکم اس نے دے دیے انھیں ہر حال میں بجالا یا جائے۔ مگر خدا صرف قادر ہی نہیں، حکیم بھی ہے۔ انسانوں کے مختلف حالات کی رعایت سے وہ اپنا حکم تبدیل کر دیتا ہے۔ معمول کی نماز ادا کرنے میں مشکل پیش آجائے تو نمازوں کو قصر اور جمع کر لینے کی اجازت دیتا ہے، کھڑے، چلتے یا سواری پر بیٹھے بیٹھے نماز ادا کر لینے کی سہولت دیتا ہے۔ مشقت زیادہ محسوس ہو تو روزہ رکھنے ہی سے رخصت دے دیتا ہے۔ مجبوری میں لقمۂ حرام کھالینے اور کلمۂ کفر کہہ کر

جان بچا لینے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو قوانین پر قربان نہیں کیا جائے گا۔ قوانین اس کے لیے بدل دیے جائیں گے۔

زیادہ با صلاحیت اور ٹیلنٹڈ لوگ عموماً آزاد منِش ہوتے ہیں۔ نظم و ضبط کی بے لچک پابندیاں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ایسے افراد میں ایک طرح کی خود پسندی، انانیت اور حساسیت بھی پائی جاتی ہے، جس کا پاس ولحاظ نہ رکھا جائے تو ٹیلنٹ ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن محکمہ جات میں نظم و ضبط پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا وہ تمام تر سہولیات دستیاب ہونے کے باوجود کوئی اچھا کھلاڑی، ادیب یا ماہرِ فن پیدا نہیں کر پاتے۔

نظم و ضبط پر کوئی سمجھوتہ نہ کر سکنا کم ذہنی کی علامت ہے۔ ایسا شخص مخصوص ڈگر سے ہٹ کر سوچنے اور کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ حوصلہ۔ روٹین اور ڈسپلن کا پجاری اینٹیں ڈھونے والے جانور کی طرح ایک ہی رستے پر ایک ہی کام بار بار کر لینے ہی کو سرمایہءِ افتخار سمجھتا ہے۔ کاغذوں میں یہ لوگ کامیاب منتظم کہلاتے ہیں، مگر ان کے زیرِ

سایہ کوئی تعمیری اور تخلیقی کام نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ جب کسی بااختیار منصب پر فائز ہو جائیں تو یہ ٹیلنٹ اور تخلیقی اذہان کے لیے موت کا اعلان ہوتا ہے۔

نجانے کتنے ہی بہترین کھلاڑی، علما، محققین اور ماہرینِ فن نظم و ضبط کی بے لچک پابندیوں کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے ہیں، حالاں کہ وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ اصول و قوانین ان کے لیے نرم کر دیے جائیں۔

قواعد و ضوابط خادم ہیں، خدا نہیں۔ ان پر عمل کیا جائے گا، ان کی عبادت نہیں کی جائے گی۔ ضرورت ہو تو انسانوں کے لیے انھیں بدل دیا جائے گا، مگر انسانوں کو ان پر قربان نہیں کیا جائے گا۔

سپیلنگ بی(Spelling Bee)پروگرام کی خامی

سپیلنگ بی (Spelling Bee) کے مقابلے کا انعقاد ڈان اخبار کے ادارے کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ تیاری کے لیے ذخیرہءِ الفاظ پر مشتمل ایک کتابچہ فراہم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک مقابلے کے لیے میرے بیٹے کو اسکول سے ایک کتابچہ ملا۔ بیٹا پرجوش تھا کہ مقابلے میں بھرپور حصہ لے گا۔

تیاری شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ کتابچہ ایسے نامانوس الفاظ پر مشتمل ہے جو خود راقم نے اپنے ساری تعلیمی و تدریسی زندگی میں کبھی سنے اور نہ پڑھے۔ بیٹے کی دلچسپی بھی برقرار نہ رہ سکی۔ میں نے بھی اس بے فائدہ سرگرمی کے لیے زور ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ معلوم ہوا کہ اچھے تعلیم یافتہ والدین بھی اپنے بچوں کو وہ الفاظ، بچوں کے احتجاج کے باوجود، یاد کروانے پر تلے رہے۔

محسوس ہوا کہ اس طرح کے مقابلوں میں مسابقت کا معیار بلند کرنے کی دھن میں ذخیرہءِ الفاظ میں نایاب و نادر الفاظ کا انتخاب بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس مشق کا کوئی

حقیقی فائدہ نظر نہیں آتا۔ یہ ستم ہے جو بچوں پر اس وقت کیا جا رہا ہے کہ جب وہ ضروری ذخیرہءِ الفاظ سے بھی ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوئے۔

نادر اور نامانوس الفاظ اگر وہ یاد کر بھی لیں تو ان کے حافظے سے محو ہو جائیں گے، اس لیے کہ ان کا استعمال بہت کم ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ طلبا کے اس قیمتی وقت اور توانائی کو درست طور پر استعمال کیا جائے۔ ذخیرہءِ الفاظ کے کھیل اور مقابلے ان کی ذہنی سطح اور تعلیمی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیے جائیں تاکہ ان کے تعلیمی سفر میں بھی معاون بنیں۔

ذخیرہ الفاظ بڑھانے کے لیے الفاظ کی فہرست یا لغت سے یاد کرنا ایک بھونڈا طریقہ ہے۔ اس کا بہترین طریقہ اپنی دلچسپی کی کتب، رسائل، اخبارات وغیرہ پڑھنا، فلمیں، ڈرامے اور دستاویزی ویڈیوز وغیرہ دیکھنا ہے۔ اس طرح ذخیرہءِ الفاظ فطری طریقے سے بڑھتا ہے۔ نہ صرف الفاظ ہی یاد ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے استعمال کا سلیقہ بھی ساتھ ہی معلوم ہوتا جاتا ہے۔ نیز، معلومات اور تخیل بھی

پروان چڑھتے ہیں۔ لغت سے الفاظ اور ان کے معانی یاد کرنے کا مطلب محض اینٹوں کا ڈھیر اکٹھا کرنا ہے، جن کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔

تعلیم کا کاروبار

عوام، بشمول تعلیم یافتگان کی ایک بڑی تعداد میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ تعلیم ایک مقدس فریضہ اور پیغمبروں کا پیشہ ہے، اسے کاروبار بنا لینا کوئی قابل تحسین کام نہیں۔ اس کی کوئی اجرت ہی نہیں ہونی چاہیے، اور ہو بھی تو قدرِ ضرورت سے زائد نہ ہو۔ نجی تعلیمی اداروں کی بھاری فیسیں اسی لیے ہدفِ تنقید بنتی ہیں۔

تاہم، حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ پیغمبروں کا کام خدا کا دین لوگوں تک پہنچانا اور اس کی تعلیم دینا تھا، سائنسی اور سماجی علوم اور پیشہ ورانہ مہارتوں کی تعلیم پیغمبروں کا کام نہیں رہا۔ اس قسم کے علوم و فنون کے لیے انھیں بھی دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی، جس کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ جنگِ بدر کے غیر مسلم قیدیوں میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان سے مسلم بچوں کو کتابت سکھائی گئی تھی اور یہی ان کی رہائی کا معاوضہ قرار پایا تھا۔

خدا کے پیغمبروں کو ان کی خاص دینی مصروفیات کی وجہ سے کسبِ معاش سے آزاد رکھا گیا تھا، لیکن ان کے معاش کا بندوبست اللہ تعالی کی سکیم میں موجود تھا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لیے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ [24] اور مال فے [25] (جو مال جنگ میں

[24] {وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ}[الانفال،8: 41]

(تم نے پوچھا تھا تو) جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا تھا، اُس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے، اُس کے پیغمبر کے لیے، (پیغمبر کے) اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔ (یہ اللہ کا حکم ہے، اِس کی بے چون و چرا تعمیل کرو)، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری تھی، جس دن دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور (جان رکھو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

[25] {مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ} [الحشر،59:7]

اِن بستیوں کے لوگوں سے اللہ جو کچھ اپنے رسول کی طرف پلٹائے، وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا تاکہ وہ تمھارے دولت مندوں ہی میں

لڑے بغیر ہاتھ آ جائے) مخصوص تھا۔ جسے آپؐ اپنے اہل خانہ اور سماج کے دیگر ضرورت مندوں کے مصارف میں خرچ کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے ہاں اللہ تعالیٰ نے یہ دستور قائم کیا تھا کہ بنی لاوی، جو ان کے دینی امور کے نگران تھے، ان کے اخراجات پورے کرنا قوم کی اجتماعی ذمہ داری قرر دی گئی تھی۔

لیکن دین کے عام خدام اور علما کے معاش کے لیے ایسا کوئی خدائی انتظام نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ان کے لیے دین کی تعلیم و تدریس کی خدمات کا معاوضہ وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ دنیا سے متعلق امور و فنون کی تعلیم کے معاوضے یا کاروبار کو نا قابل رشک نگاہ سے دیکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہی بات مبنی بر حقیقت اور قرینِ انصاف ہے۔

گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول (کا منصب یہی ہے کہ) جو تمھیں دے، وہ لے لو اور جس چیز سے روکے، اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔

جس طرح سستی اور معیاری سفری سہولتیں اور علاج معالجہ کی فراہمی جدید ریاست کی ذمہ داری شمار ہوتی ہے، اسی طرح سستی اور معیاری تعلیم کی فراہمی بھی اس کی ذمہ داری قرار پائی ہے۔ تاہم تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی سرکاری تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ حکومتی ترجیحات میں اس کا درجہ بہت نیچے ہے۔ اس صورت حال میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ معیاری تعلیم کی کمی پوری کرنے کے لیے نجی شعبے سے حوصلہ مند اور باصلاحیت افراد آگے بڑھتے اور سماج کو مطلوبہ خدمات فراہم کر کے معاوضہ وصول کرتے، ایسے ہی جیسے طب اور ٹرانسپورٹ کے میدانوں میں نجی سطح پر افراد، ہسپتال اور کمپنیاں مطلوبہ سہولیات فراہم کرتی اور اس سے مالی فوائد بھی حاصل کرتی ہیں۔

تعلیم و تدریس کے لیے بھی انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمارت، اس کا کرایہ، لیبارٹری اور سپورٹس کا سامان، یوٹیلیٹی بلز، اور سب سے بڑھ کر اساتذہ اور دیگر عملے کی تنخواہیں۔ اس ساری تگ و دو اور درد سری کا اطمینان بخش معاوضہ

اور منافع ملنا اخلاقیات کے کسی بھی پیمانے سے غلط نہیں۔ اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ تعلیم کا کاروبار بھی ایک درست کاروبار ہے۔ البتہ فیس کے لحاظ سے تعلیمی معیار کو یقینی بنانا تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے اور والدین ان سے جواب دہی کا حق رکھتے ہیں۔

پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں ایک استاد کا تجربہ جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے اس کی خدمات کی طلب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ بھی اس کا حق بنتا ہے۔ ایثار یا بے غرض خدمات پیش کرنا انفرادی ذوق اور رجحان کا معاملہ ہوتا ہے، جو چند ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کی بنا پر عام لوگوں سے ایثار اور بے غرضی کا مطالبہ کرنا معقول نہیں۔ اپنی ضروریات سے بندھے ہوئے عام لوگ عمومی رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔ سماج کو عمومی رجحانات ہی قائم رکھتے ہیں۔ ہر کوئی درویش صفت ہونے لگے تو سماج تباہ ہو جائے۔ پھر ایثار کا مطالبہ صرف استاد یا نجی تعلیمی اداروں کے مالکان ہی سے کیوں؟ یہ مطالبہ ہر اس شخص

سے کیا جا سکتا ہے جس کا پیشہ مقدس سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر اور جج سے اس طرح کی بے غرضی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، اسی طرح اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے مالکان سے بھی نہیں کرنا چاہیے۔

تعلیمی اداروں کے اخراجات ہر علاقے اور ہر طبقے کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ طبقات کا یہ فرق جس طرح ریستورانوں، کپڑوں کے برینڈز وغیرہ میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تعلیم کے مختلف معیارات میں بھی اس کا ظاہر ہونا بھی بالکل فطری بات ہے۔

یہ فیصلہ لوگوں کے وسائل اور ذوق پر منحصر ہے کہ وہ بچوں کو کس معیار کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ وسائل کی کمی کے سبب سے معیاری تعلیم نہ دلا سکنا افسوس ناک ہے، مگر اس کا علاج نجی تعلیمی اداروں سے ایثار کے مطالبے میں نہیں، وسائل میں اضافے اور سرکاری اسکولوں کے معیار میں بہتری لانے میں ہے تاکہ ہر کوئی معیاری تعلیم پانے کا موقع پا سکے۔

نجی کاروبار کرنا آسان کام نہیں، خصوصاً پاکستان میں جہاں کاروبار کے لیے حالات اکثر غیر یقینیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کاروبار کی ہمت جٹانے والے داد کے مستحق ہیں۔ تعلیم کو بطورِ کاروبار اختیار کرنے والے ایک بھاری اور نازک ذمہ داری اٹھاتے ہیں، جس میں کسی کوتاہی کی گنجایش نہیں دی جا سکتی۔ انھیں چاہیے کہ اپنا کاروباری فریضہ پوری دیانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں۔

نابینا طلبا کی مشکلات[26]

وطن عزیز کی تعلیم گاہوں میں نابینا طلبا کو درکار ضروری سہولیات عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس وجہ سے ان کے لیے مطلوبہ تعلیمی قابلیت کا حصول بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ نابینا پن کے ساتھ جب قابلِ حصول قابلیت بھی میسر نہ آ سکے تو عملی مہارتوں کے مسابقانہ میدان میں ان کا کیریئر کہیں راہ نہیں پا سکتا۔

ہمارے تعلیمی نظام میں میٹرک تک بریل سسٹم کی سہولت موجود ہے، جس کی مدد سے نابینا طلبا خود پر انحصار کرتے ہوئے تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، لیکن امتحانات میں انھیں معاون لکھاری فراہم کیا جاتا ہے جو ان کا بولا ہوا لکھتا ہے۔ لکھاری پہلے سنتا ہے پھر لکھتا ہے۔ یوں پرچہ حل کرنے کے لیے ان طلبا کو عام طلبا کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، مگر انھیں زائد وقت نہیں دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات

---

[26] (طالبہ میمونہ مقصود کے تعاون سے لکھا گیا)

لکھاری کی قابلیت کم ہوتی ہے یا کسی لفظ کے ہجے یا انگریزی یا عربی وغیرہ لکھنے کی اچھی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے بھی ان کے جوابات کا معیار متاثر ہوتا ہے۔

ملک کے ایک جامعہ میں سروے کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ بیشتر اساتذہ نابینا طلبا کو پڑھانے کی مناسب تربیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنا لیکچر ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے دیے ہوئے نوٹس کو پڑھ کر سنانے کے نابینا طلبا کو ساتھی طلبا سے درخواست کرنا پڑتی ہے۔ بعض اساتذہ نابینا طلبا پر ترس کھاتے ہوئے دیگر طلبا کی اسائمنٹس میں ان کا نام بطورِ معاون لکھوا دیتے ہیں تاکہ انھیں خود اسائمنٹس بنانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ اس سے نہ صرف ان کی تعلیمی صلاحیت بری طرح متاثر ہوتی بلکہ اپنی بے چارگی کا احساس بھی مزید گہرا ہوتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض ساتھی طلبا کو ان سے مناسب طریقے سے برتاؤ کرنا نہیں آتا۔ ان سے ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ وہ اپنے کپڑے کیسے پہنتے ہیں، اپنے بال کیسے درست کرتے ہیں۔ طلبا اور

اساتذہ کی طرف سے انھیں نظر انداز بھی کیا جاتا اور یہ تنہائی کا شکار بھی ہوتے ہیں۔

لائبریری کی سہولت سے بھی نابینا طلبا کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ لائبریریوں کے کمپیوٹرز میں نابینا افراد کے لیے بولنے والے خاص پروگرام موجود نہیں ہوتے۔ انٹرنیٹ سے ضروری مواد کے حصول کے لیے انھیں اپنے ذاتی سمارٹ فونز اور ٹیبز استعمال کرنے پڑتے ہیں جس میں وہ اپنی سہولت کے بولنے والے خاص پروگرام ڈال لیتے ہیں۔ یہ خرچ انھیں خود اٹھانا پڑتا ہے۔ مالی طور پر کمزور طلبا کے لیے یہ ایک اضافی بوجھ ہے۔

ہر سیمسٹر میں انھیں اپنے اندھے پن کا سرٹیفیکیٹ جامعہ کی انتظامیہ سے لے کر اپنے شعبے میں پیش کرنا پڑتا ہے، جو اپنے آپ میں ایک اذیت رسانی ہے۔

نابینا طلبا کے لیے ان کی تعلیم گاہوں کا تقریباً تمام نظام انفرادی رحم اور ہمدردی کے اخلاقی اصول پر چلتا ہے۔ ہمدردی مل جائے تو غنیمت، نہ ملے تو نظام میں کوئی

صلاحیت نہیں کہ ان کی مدد کرے۔ لیکن اس ہمدردی سے ان کی عزتِ نفس مجروح اور خود انحصاری کی راہ مسدود ہوتی ہے۔

ضروری ہے کہ نابینا طلبا کے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے تمام تعلیم گاہوں میں ایک جامع لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔ تعلیمی بورڈز اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) اس سلسلے میں اپنا کردار سنجیدگی سے ادا کریں۔

نابینا طلبا کو جو ضروری سہولیات فوری طور پر درکار ہیں وہ درج ذیل ہیں:

- ہر سیمسٹر میں نابینا طلبا کو اپنے اندھے پن کا سرٹیفیکیٹ متعلقہ شعبے میں جمع کرانے کے عمل سے نجات دی جائے۔ ادارہ خود کار طریقے سے یہ کام انجام دے۔

- تمام تعلیم گاہوں میں نابینا طلبا کے لیے بریل سسٹم کی سہولت فراہم کی جائے۔ اس کے لیے ایک ریسورس سنٹر قائم کیا جائے جہاں بریل پرنٹر کی سہولت ہمہ وقت دستیاب ہو۔ تمام ماڈیولز، نوٹس اور کتب بریل میں مہیا کی جائیں۔

- ریسورس سنٹر میں Optical Character Recognition (او سی آر) سکینر مہیا کیے جائیں۔ یہ چھپے ہوئے مواد کو سکین کر کے اسے بولتا ہے، جسے نابینا طلبا ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ طلبا عام کتب اور نوٹس سے بھی استفادہ کر سکیں گے۔

- تعلیم گاہوں میں لائبریری اور کمپیوٹرز میں نابینا افراد کے لیے تیار کیے گئے بولنے والے خاص پروگرام مہیا کیے جائیں۔

- نابینا طلبا کو انٹرنیٹ پیکجز کا خرچ دلایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے پاس موجود ٹیبز اور سمارٹ فونز کے ذریعے سے اپنی تعلیمی ضروریات پوری کر سکیں اور بار بار لائبریری اور کمپیوٹر لیب جانے کی زحمت میں بھی کمی آئے۔

- امتحانات کے مروجہ طریقے میں نابینا طلبا کو پرچوں میں لکھاری کو بول کر لکھوانا ہوتا ہے، جس میں زیادہ وقت لگتا ہے، اس لیے انھیں پرچہ حل کرنے کے لیے زیادہ وقت دیا جائے۔

- نابینا طلبا کے امتحانات نابیناؤں کے لیے مخصوص کی بورڈز پر ٹائپنگ کے ذریعے سے لیے جائیں۔
- حکومت، تعلیمی بورڈز اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) نابینا طلبا کے لیے سمارٹ عینک کے حصول کے لیے مالی معاونت فراہم کریں۔ اس عینک کی مدد سے وہ ایک حد تک چہروں اور سمت کی شناخت کر سکتے اور خود چل پھر بھی سکتے ہیں۔
- تعلیم گاہوں کے کیفے میں نابینا طلبا کی سہولت کے لیے الگ کاؤنٹر یا مخصوص فرد کا بندوبست جائے تاکہ رش کے اوقات میں وہ بآسانی خریداری کر سکیں۔

حصہ دوم: والدین کی تربیت

بچے کو گود دینا

اپنے والدین کی آغوش میں پرورش پانا، بچے کا فطری حق ہے۔ بغیر کسی مجبوری کے اپنے بچے کو کسی دوسرے کو گود دے دینا اس کی حق تلفی ہے۔ بچے کو دنیا میں لانے کا ارادہ تبھی کرنا چاہیے جب والدین اس کی ذمہ داری اٹھانے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں۔

ایک لے پالک بچے کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنھیں وہ اپنے ماں باپ سمجھتا رہا وہ اس کے حقیقی والدین نہیں، تو اس کی دنیا اُتھل پُتھل ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ یہ باور کرتا ہے کہ اس کے اصلی والدین نے اسے گویا ایک زائد شے سمجھ کر کسی کا دل بہلانے یا کسی کی تنہائی دور کرنے کے لیے اسے دوسرے کے سپرد کر دیا تھا، تو اپنی ناقدری کا احساس اس کی نفسیات کو مجروح کر کے رکھ دیتا ہے۔

ولدیت کی تبدیلی جھوٹ اور دھوکا ہے۔ اسلام کسی صورت میں بچوں کی ولدیت تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک ہدایت دی گئی ہے کہ کسی بچے کا باپ

اگر معلوم نہ ہو سکے، تو اسے دینی بھائی سمجھا جائے، لیکن اس کی ولدیت کسی اور سے منسوب نہ کی جائے۔[27]

اپنا بچہ دوسرے کو گود دے دینا ایثار نہیں ہے۔ ایثار میں اپنا حق چھوڑا جاتا ہے، دوسرے کا حق تلف نہیں کیا جاتا۔ اپنے والدین سے پرورش پانا بچے کا حق ہے۔ یہاں اس کا حق تلف ہوتا ہے۔ یہ کارِ ثواب نہیں، گناہ کا کام ہے۔ اس معاملے میں والدین اپنا حق نہیں چھوڑتے، بلکہ اپنا فرض چھوڑتے ہیں۔

---

[27] وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ ۚ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ ۚ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (الاحزاب، 33:4-5)

اور (خدا نے) نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا بنا دیا ہے۔ یہ سب تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، مگر اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ تم منہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ پھر اگر اُن کے باپوں کا تم کو پتا نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے حلیف ہیں۔ تم سے جو غلطی اِس معاملے میں ہوئی ہے، اُس کے لیے تو تم پر کوئی گرفت نہیں، لیکن تمھارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا، اُس پر ضرور گرفت ہے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ (البیان)

یہاں مریم علیہا السلام کے واقعہ سے یہ استدلال کیا جاسکتا کہ ان کی والدہ نے ان کی پیدایش سے پہلے انھیں خدا کے نام پر وقف کر دیا تھا، اس لیے والدین کو حق ہے کہ وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیں۔[28]

قرآن مجید میں منقول مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا، در حقیقت، ان کی خواہش کا اظہار تھی کہ وہ اپنے ہونے والے بچے کو خدا کے نام پر اس کے دین کی خدمت کے

---

[28] إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (آل عمران، 3: 35-36)

اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔ پھر جب اُس نے اُس کو جنا تو بولی کہ پروردگار، یہ تو میں نے لڑکی جن دی ہے ـــــ اور جو کچھ اُس نے جنا تھا، اللہ کو اُس کا خوب پتا تھا ـــــــــــــ اور (بولی کہ) وہ لڑکا اِس لڑکی کی طرح نہ ہوتا۔ (خیر اب یہی ہے) اور میں نے اِس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور اِس کو اور اِس کی اولاد کو میں شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ (اُس کے احساسات یہی تھے)، تاہم اُس کے پروردگار نے اُس لڑکی کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمایا اور نہایت عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اُس کا سرپرست بنا دیا۔

لیے وقف کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مریم علیھا السلام پر اپنی والدہ کی اس خواہش کی تکمیل لازم نہ تھی۔ ایسے ہی جیسے بچپن کے نکاح کی پابندی شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچ کر لازم نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ مریم علیھا السلام کی اپنی طبیعت بھی اُسی طرف مائل رہی جس کی دعا ان کی والدہ نے کی تھی۔

پھر اصولی طور پر ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کے پیدا ہوتے ہی انھیں دین کے خدّام کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے اسمعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے بلا تاویل اس پر عمل کرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی رائے لی تھی، اور اس کی رضامندی کے بعد ہی اقدام کیا تھا۔ مریم علیھا السلام کا یہ معاملہ بھی ان کی رضامندی ہی سے طے ہوا ہو گا۔ اسی طرح باشعور بچوں کو ان کی رضامندی سے ان کی بہتری کے لیے کسی کے حوالے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

والدین، بچے کی پرورش میں اتنا ہی تصرّف کر سکتے ہیں جو بچے کے حق میں ہو، اس کی حق تلفی میں کوئی تصرّف کرنے کا انھیں کوئی اختیار نہیں۔ جس طرح وہ اسے قتل نہیں کر سکتے، بیچ نہیں سکتے، اسی طرح اسے اپنی ممتا اور شفقت سے محروم کر کے کسی دوسرے کے حوالے بھی نہیں کر سکتے۔

بچہ والدین کی ملکیت نہیں، امانت ہے، جو ان کی خواہش پر ان کے سپرد کی جاتی ہے۔ یہ انھیں کا فرض ہے کہ اس بارِ امانت کو اٹھائیں اور نبھائیں۔

والدین کی غلامانہ فرماں برداری

والدین کی غلامانہ فرماں برداری کا تصور جاگیر دارانہ معاشرت کے تقاضوں سے پیدا ہوا اور ایک تہذیبی قدر بن گیا۔ جاگیر دار سب سے پہلے ایک منتظم ہوتا ہے، جسے اپنی جاگیر کی حفاظت کے لیے ایک بڑے خاندان کو اکھٹا رکھنا ہوتا ہے۔ اس نظام میں اولاد سمیت خاندان کے کسی فرد کو جاگیر دار کے فیصلوں سے انحراف کی اجازت نہیں ہوتی کیوں کہ کوئی ایک انحراف اس کی رِٹ کو چیلنج کر کے اسے کم زور کر سکتا اور اس کے حریفوں کو شہ دے سکتا ہے۔

جاگیر دار کی صورت میں باپ کا یہ وہ مثالی تصور ہے جس کی تقلید سماج کے دیگر طبقات بھی کرتے ہیں۔ باپ کا یہی تصور ادب و شاعری، ضرب الاَمثال اور داستانوں میں بیان ہوتا اور اسے ایک تہذیبی قدر بنا دیتا ہے۔ اس باپ کا صرف احترام ہی نہیں کیا جاتا، بلکہ اس سے ڈرنا بھی لازم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی فرماں برداری ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی غلامی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ ماں کی غیر مشروط اطاعت کا تصور بھی اسی کے ساتھ پروان چڑھا تاکہ غلامانہ فرماں برداری کی تربیت دینے میں کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔

اس طرزِ فرماں برداری میں اولاد کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ والدین کے حکم پر اپنی جائز اور معقول خواہشات حتیٰ کہ اپنے ذوق کے اظہار سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ والدین کے لیے یہ احساس باعثِ طمانیت و افتخار ہوتا ہے کہ ان کی اولاد نے اپنی خواہش قربان کرکے ان کے کسی ناگوار فیصلے کو قبول کرلیا۔

والدین کے اس آمرانہ رویے کا اظہار ہماری زبان کے محاوروں اور تعبیرات میں بھی نمایاں ہے، مثلاً، "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ سے"۔ بیٹی کی فرماں برداری کے لیے یہ محاورہ ایجاد کیا گیا ہے کہ "بیٹی کو جس کھونٹے سے باندھا وہ بندھ گئی۔"

شہری گھرانوں میں شہری تقاضوں، جدید تعلیم، روزگار کے انتشار اور چھوٹے گھروں کی وجہ سے چھوٹے خاندان کی تشکیل اور آزادیءِ افکار وغیرہ کے رجحانات

کی وجہ سے کلچر تبدیل ہوا تو والدین کی غلامانہ فرماں برداری کے رویے میں بھی تبدیلی آئی، جسے بزرگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

غلامامہ ذہنیت پیدا کرنے کے لیے من گھڑت قصے کہانیوں سے بھی مدد لی جاتی ہے اور مذہب سے بھی۔ مثلاً یہ کہانی کہ ایک بچہ ساری رات ماں کے سرہانے پانی لیے کھڑا رہا جس پر اسے جنت کی بشارت ملی۔ اسلام میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کو ان کی غلامانہ اطاعت کا مترادف بنا دیا گیا۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب یہ ہوا کہ ماں کے ہر جائز و ناجائز حکم کی تعمیل کی جائے، ورنہ جنت میں داخلہ نہیں ملے گا۔

اسلام میں والدین کی غلامانہ فرماں برداری کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن مجید نے والدین کی اطاعت کا نہیں، بلکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ذکر کے ساتھ جب والدین کا ذکر آتا ہے تو اطاعت کا لفظ بدل کر "احسان" اور "حسناً" کے الفاظ اختیار کر لیے جاتے

ہیں۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا، ان کے بڑھاپے میں ناگواری کے مواقع پر بھی صبر اور شفقت کے ساتھ ان کی خدمت کی جائے گی۔[29] لیکن ان کے کسی ناجائز حکم کی تعمیل نہیں کی جاسکتی، جس کا نتیجہ اپنے یا دوسروں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی صورت میں نکلتا ہو۔[30] اسی طرح ان کے غیر ضروری مطالبات

[29] وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۚ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا (الاسراء، 17: 23-25)

تمھارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ تنہا اُسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں اگر تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ اُن کو اف کہو اور نہ اُن کو جھڑک کر جواب دو، تم اُن سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ اور اُن کے لیے نرمی سے عاجزی کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، اُن پر رحم فرما، جس طرح اُنھوں نے (رحمت و شفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا۔ (لوگو)، تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو پلٹ کر آنے والوں کے لیے وہ بڑا درگذر فرمانے والا ہے۔

[30] عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (صحیح مسلم، 1839)

پورے کرنا اولاد کی اخلاقی ذمہ داری نہیں۔ والدین کو اولاد کے ذوقی معاملات میں بھی حاکمانہ مداخلت کا حق نہیں۔ شخصی آزادی کے اس دائرے میں اللہ تعالی بھی اپنا اختیار استعمال نہیں کرتے۔

والدین کی وہ نافرمانی گناہ کے زمرے میں شمار ہوگی جس کا بجالانا اخلاقی لحاظ سے اولاد کے لیے ضروری ہو۔[31] اولاد کی جنت کی طرح والدین کی جنت بھی اولاد کے ساتھ ان کے حسن سلوک اور ان کی عمدہ تربیت کی ذمہ داری پوری کرنے پر منحصر

اہل ایمان پر واجب ہے کہ خواہ انھیں پسند ہو یا ناپسند، وہ بہرحال اپنے حکمرانوں کی بات سنیں اور مانیں، سوائے اس کے کہ انھیں کسی معصیت کا حکم دیا جائے، پھر اگر معصیت کا حکم دیا گیا ہے تو وہ سنیں گے اور نہ مانیں گے۔

[31] عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْكَبَائِرِ، قَالَ: «الشِّرْكُ بِاللهِ، وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَقَوْلُ الزُّورِ (صحیح مسلم، 88)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں کے متعلق فرمایا "وہ شرک کرنا ہے اللہ کے ساتھ اور نافرمانی کرنا ماں باپ کی اور خون کرنا (ناحق) اور جھوٹ بولنا۔

ہے۔ اس کے لیے وہ بھی خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

والدینیت کے زعم میں والدین کی کوتاہیاں

ہمارے ہاں والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ عام گفتگو کا رواج نہیں ہے۔ ان کے درمیان بات چیت چند مخصوص ہدایات، احکامات اور فرمائشوں تک محدود رہتی ہے۔ یہ عموماً کھانے، پہننے، دانت برش کرنے، نہانے، ہوم ورک کرنے، وقت پر سونے اور زندگی کے دیگر آداب سکھانے جیسی ہدایات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتیں۔ اسی کو والدینیت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کی صحبت میں وقت گزارنا اور ان کے ساتھ گپ شپ کرنا معمول میں شامل ہی نہیں ہوتا۔

بچے اسکول سے آتے ہیں تو ٹیوشن پڑھنے بھیج دیے جاتے ہیں، وہاں سے چُھوٹتے ہیں تو قاری صاحب انھیں دھر لیتے ہیں، اس کے بعد ٹی وی یا انٹرنیٹ پر کچھ دیر کوئی پروگرام، گیم یا چیٹنگ میں وقت گزرتا ہے اور ادھر سونے کا وقت ہو جاتا ہے۔ بچوں کو اتنا مصروف کر دیا گیا ہے کہ ان کے پاس والدین کے لیے وقت ہی نہیں رہا اور والدین بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ان سے ایک فاصلے پر رہیں۔ بچے اس

سب کے باوجود کبھی ان کے قریب آنے کی کوشش کریں تو کچھ دیر بعد ہی انھیں اپنے پاس سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

بچے کے بنتے بگڑتے خیالات سے والدین اکثر بے خبر رہتے ہیں۔ بچہ اگر اپنے ذہن میں گردش کرتے سوالات، اپنے خوف و خدشات اور اپنے غلط درست اندازوں اور نتائج کا ذکر والدین سے نہیں کر پاتا تو یہ والدین کی ناکامی ہے۔

بلوغت کے قریب اپنی جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں اور ان کی وجہ سے اپنے مزاج میں پیدا ہونے والی بے چینی اور تلخی کے رویوں میں بچہ اگر والدین کی رہنمائی اور ان کے صبر و تحمل سے محروم رہتا ہے، تو یہ والدین کی ناکامی ہے۔

بچوں سے جذبات کی رو میں بہ کر کوئی غلطی ہو جائے، وہ ضمیر کی خلش کا شکار ہو جائیں، اور اس گھٹن سے نجات پانے کے لیے والدین کو اس ڈر سے مطلع بھی نہ کر سکیں کہ مبادا ان سے قطع تعلق کر لیا جائے گا یا ہمیشہ کے لیے نظروں سے گرا دیا جائے گا، تو یہ بھی والدین کی ناکامی ہے۔

بچے کا والدین سے اپنے دل کی بات کرنے کا راستہ اگر استوار رہے تو وہ کبھی خود کشی نہیں کر سکتا، نشے کا شکار نہیں ہو سکتا، اسے ہسٹیریا کے دورے نہیں پڑیں گے، اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

کچھ والدین کا یہ وتیرہ ہوتا ہے کہ اولاد کو سمجھانے کے لیے ان کے دوستوں یا رشتہ داروں کے توسط سے اپنی بات ان تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بچے کو دوسروں کی نظروں میں چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ والدین کی یہ حرکت درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود سمجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کا عتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

والدین سے گفتگو کی روایت اور عادت نہ ہونے کے ساتھ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ بھی والدین سے بات چیت نہیں کر پاتے۔ عمر کے آخری حصے میں جب ماں اور باپ اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں، ان کے دوست اور رشتہ دار یا تو دنیا سے رخصت ہو چکے ہوتے ہیں یا وقت گزاری کے لیے میسر نہیں ہوتے، اس

وقت وہ اپنے دل کی باتیں کرنے کے لیے اپنے بچوں کی طرف پلٹتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر ہوچکی۔ مکالماتی خلاCommunication Gap کی خلیج کو پاٹنے کا وقت اب نہیں رہا۔ ماں باپ کو دل کی باتیں بتانے کے لیے ترسنے والا بچہ اب بڑا ہوچکا ہوتا ہے۔ وہ جو کبھی خود کلامی سے دل بہلالیتا تھا یا کسی ہم راز کو تلاشتا پھرتا تھا، اب گفتگو کے لیے اس کے پاس اپنے محرم ہوتے ہیں۔ والدین کے ساتھ دل سے زبان تک کا راستہ ماہ وسال کی ریت میں پٹ چکا ہوتا ہے۔ اس کی بازیافت اب ممکن نہیں رہتی۔

والدین بچپن کی یادگار بن کر رہ جاتے ہیں، جن سے جذباتی وابستگی تو ہوتی ہے مگر ذہنی قربت اس درجے کی نہیں ہوتی کہ گفتگو کا تعلق پیدا کیا جاسکے۔ یہ اولاد والدین کی تکلیف پر رو سکتے ہیں، ان کے علاج پر اپنا سب کچھ قربان کرسکتے ہیں، لیکن بے بسی کا عالَم یہ ہوتا ہے کہ چاہ کر بھی وہ ان کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر دل جمعی سے بات نہیں کرسکتے۔ ان کے الفاظ، محاورے، موضوعات سب ایک دوسرے

کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ اب والدین سے ان کا تعلق بھی چند ہدایات تک ہی محدود رہ جاتا ہے: "آپ نے کھانا کھالیا؟" "دوا وقت پر لے لی؟" "مارکیٹ جا رہا ہوں، آپ کو کچھ منگوانا ہو تو بتایئے"۔

بہت سہولت سے اولاد کو مَوردِ الزام ٹھہرا دیا جاتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر میں والدین سے بات نہیں کرتے۔ پھر وہ کہانی سنائی جاتی ہے کہ ایک بوڑھا ایک کوّے کو دیکھ کر جوان بیٹے سے پوچھتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ بیٹا جواب دیتا ہے کہ کوّا ہے، باپ چند بار مزید پوچھتا ہے۔ بیٹا تنگ آجاتا ہے۔ اس پر باپ اپنی ڈائری لے کر آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ تم نے اپنے بچپن میں بیس مرتبہ کوّے کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے ہر بار لطف لیتے ہوئے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کوّا ہے۔

اس کہانی میں لڑکے کے بچپن سے اس کی جوانی کی طرف یک دم چھلانگ لگادی گئی ہے، اور بیچ میں یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ لڑکا جب کچھ بڑا ہوا تھا تو باپ نے اس سے فاصلہ بنالیا تھا۔ وہ اس کی ضرورتیں تو پوری کرتا تھا مگر اس کے ساتھ کھیلتا نہیں تھا،

اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس سے بے تکلف نہیں رہا تھا۔ اور پھر یہ ہوا تھا کہ والدین سے گفتگو کی ضرورت ہی ختم ہوگئی تھی۔

ہمارے ہاں ایک خام خیالی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں کم محبت کرتے ہیں اور یہ کہ بیٹوں سے زیادہ محبت جتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیٹے اور بیٹی کے اظہارِ محبت میں جو فرق نظر آتا ہے وہ ان کے ساتھ والدین کے مختلف رویوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جب والدین بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں سے کم پیار جتاتے ہیں اور ان پر رعب قائم رکھنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان سے ایک فاصلے پر رہیں، تو بیٹے بھی اظہار محبت میں کم آمیز ہو جاتے ہیں۔ برتاؤ اور رویے بچے اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ محبت کے اظہار میں وہی رویہ ان سے ظاہر ہوتا ہے جیسا ان کے ساتھ برتا گیا ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں لوگ فخر سے بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی۔ والد صاحب کے گھر آتے ہی پورے گھر پر سناٹا طاری ہو

جاتا ہے۔ والد صاحب اپنی اس آمرانہ حاکمیت کا لطف لیتے لیتے جب ریٹائرڈ ہو کر چارپائی سے لگ جاتے ہیں تو ان کی خدمت کرنے والے تو بہت ہو سکتے ہیں، لیکن ان سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دل کی باتیں آپ کسی سے نہ کر سکیں، اس سے بڑھ کر کیا اذیت ہو سکتی ہے!

چند انتہائی نوعیت کے واقعات میں دیکھا جاتا ہے کہ اولاد والدین کو ان کے بڑھاپے میں بے سہارا چھوڑ جاتی ہے۔ یہ رویہ جہاں اولاد کی سنگ دلی کو ظاہر کرتا ہے وہاں یہ بھی بتاتا ہے کہ اولاد کی تربیت میں شدید کوتاہی برتی گئی ہے۔ ایک نارمل انسان کو ایسے خلاف انسانیت رویوں تک لے آنا آسان نہیں ہوتا، اس میں بہت کچھ حصہ والدین کے رویوں کا ہوتا ہے۔ تاہم، ان غیر معمولی واقعات کی تعداد ان غیر معمولی واقعات سے زیادہ نہیں ہوتی جن میں والدین بچوں کو ان کے بچپن میں چھوڑ جاتے ہیں یا انھیں قتل تک کر دیتے ہیں۔ ایسے استثنائی واقعات کو

استثنائی دائرے ہی میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ کسی سماجی یا عمومی رجحان کا پتا نہیں دیتے۔

والدین اوراولاد کے درمیان دوری پیدا ہونے میں قصور اکثر والدین کا ہوتا ہے۔ آج اپنے بچوں کے ساتھ گفتگو کا تعلق قائم کیجیے، کل وہ بھی اپنی باتوں سے آپ کی تسکینِ طبع کا سامان کر پائیں گے۔ ورنہ یہ شعر زیرِلب پڑھتے ہوئے وقت گزارے گا:

منہ لپیٹے پڑے رہو ناصرؔ
ہجر کی رات ڈھل ہی جائے گی

جوان ہوتی اولاد کے ساتھ والدین کے تعلق کا بگاڑ

جوان ہوتی اولاد اور والدین، خصوصاً بیٹوں اور والد کے درمیان بعض اوقات ناراضی بلکہ تنفر کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ فطری محبت کبھی فنا نہیں ہوتی اور وہ ایک دوسرے کے پیار کو ترستے بھی رہتے ہیں مگر اپنے درمیان تعلق بحال نہیں کر پاتے۔ وقت کی ریت میں دب جانے والی ان کی محبت بیماری اور وفات جیسے غیر معمولی حادثات کے وقت ہی نمایاں ہو پاتی ہے، جو پچھتاوے کے گہرے زخم چھوڑ جاتی ہے۔

اولاد کے ساتھ والدین کے تعلق کے اس بگاڑ کا الزام بڑی آسانی سے بیٹے کی اٹھتی نوجوانی کو دے دیا جاتا ہے، جب کہ اس کی بڑی اور بنیادی وجہ ماں اور باپ کا رویہ ہوتا ہے۔

والدین اور اولاد کے تعلق کے اس بگاڑ کی چند بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:

بوڑھے ہوتے باپ کو جوان ہوتے بیٹے میں اپنا جانشین دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کی مشقتوں سے تھکا ہارا باپ اپنی ذمہ داریاں بیٹے کے کاندھے پر ڈال کر سبک دوش ہو جانا چاہتا ہے۔ اس جلد بازی میں وہ یہ نظر انداز کر دیتا ہے کہ بیٹا ابھی جوانی اور بچپنے کے درمیان ڈول رہا ہے، وہ نوجوانی کے لاابالی پن کا لطف لینا چاہتا ہے، ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے مطلوبہ سنجیدگی اختیار کرنے میں اسے کچھ وقت لگے گا۔ مگر باپ اپنی بے صبری میں بیٹے کی کچی جوانی کی نادانیوں اور کوتاہیوں کو معاف نہیں کر پاتا۔ یوں بیٹے کے ساتھ اس کے تعلق میں تلخی پید ہو جاتی ہے۔

اس سے مختلف ایک وجہ باپ کا اپنے جوان ہوتے بیٹے سے عدم تحفظ محسوس کرنا ہے۔ اسے بیٹے میں اپنا رقیب نظر آتا ہے، جو خاندان میں اس کی حکومت کو چیلنج کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مناسب وقت آنے پر بھی وہ اسے خود مختار نہیں ہونے دیتا اور یوں بیٹے کو اپنا حریف بنالیتا ہے۔

باپ اور بیٹے کے تعلقات کے خراب ہونے کی ایک وجہ ماں کا کردار بھی ہے۔ مشرقی عورت ہمیشہ سے عدم تحفظ کا شکار رہی ہے۔ جوان ہوتے بیٹوں کی صورت میں اسے جب ایک مضبوط سہارا گھر ہی میں دستیاب ہو جاتا ہے تو وہ اپنے شوہر کی طرف سے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے بیٹوں کو باپ کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

بعض مائیں اپنی جوان ہوتی اولاد سے بے زار اور متنفر ہو جاتی ہیں۔ انھیں یہ سوچ کر کوفت ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت کے کچھ گوشے اب ان پر اس طرح عیاں نہیں رہیں گے جیسے بچپن میں وہ ان کے لیے کھلی کتاب تھے۔ ان پر اپنے اختیار کی گرفت کم زور پڑتی دیکھ کر انھیں برا لگتا ہے۔

ماں کا یہ خدشہ کہ جلد ہی بیٹے اپنی بیویوں کو اور بیٹیاں اپنے شوہروں کو ماں پر ترجیح دیا کریں گی، اسے وقت سے پہلے اولاد سے متنفر کرنے لگتا ہے۔

اسی طرح ماں اور باپ کا یہ خوف کہ اس کے بڑھاپے میں اس کی اولاد اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی، انھیں وقت سے پہلے ہی اولاد سے بدگمان کر دیتا ہے۔

کم وسائل رکھنے والے والدین اپنی اولاد کی نظر میں اس لیے بھی وَقعت کھو دیتے ہیں کہ خود انھوں نے اسے یہی سکھایا ہوتا ہے۔ والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے وسائل کی کمی پر شکوہ شکایت، لڑائی جھگڑے، پیسے کے بدلے عزت دینے اور اس کی کمی کی صورت میں ذلت آمیز سلوک کرنے جیسے رویوں کے مظاہرے انھوں نے خود اولاد کے سامنے برتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اولاد کو جب وسائل کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو والد پر ترس آنے کی بجائے وہ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

اولاد کو نوجوانی میں کچھ گنجایش درکار ہوتی ہے جہاں وہ اپنی ابھرتی امنگوں کو اپنے تئیں بروے کار لا کر زندگی کرنا سیکھ سکیں۔ اس موقع پر ان کے تجربات اور

رجحانات پر کڑی نظر رکھنا اور اپنی مرضی کرنے کے مناسب مواقع دینے سے انکار کرنا کہ مبادا خراب ہو جائیں گے، ماں باپ اور اولاد کے درمیان تلخی کا سبب بن جاتا ہے۔

اولاد کے ساتھ ان کے بچپن میں کی گئی محبت اور شفقت ان کی نوجوانی میں ان کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کا بدل نہیں ہو سکتی۔ والدینیت، اولاد کے لیے محبت اور ایثار کی مسلسل ذمہ داری ادا کرنے کا نام ہے، جو اگر اچھے طریقے سے ادا کی جائے تو اس کا پھل کبھی کڑوا نہیں ہوتا۔

اللہ میاں گناہ دیں گے!

'اللہ میاں گناہ دیں گے'، ہمارے سماج میں بچوں کی تادیب کے لیے اس جملے کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بڑوں کے ہاتھ میں خدائی لائسنس ہے کہ جس چیز کو چاہیں گناہ قرار دے دیں۔ یہ جملہ ہر اس معمولی سی بات سے منع کرنے کے لیے بھی بول دیا جاتا ہے جو محض خلافِ ادب یا ناگوارِ خاطر ہو، جیسے انگلیاں چٹخانا، بیٹھے ہوئے ٹانگیں ہلانا، الٹا لیٹ کر سونا، کھڑے ہو کر پانی پینا، اونچی آواز میں ہنسنا، نماز یا قرآن پڑھتے ہوئے ٹوپی نہ پہننا، وغیرہ۔ یہ خدا کے نام پر جھوٹ باندھنے کا عظیم گناہ ہے۔ حلال و حرام اور گناہ و ثواب کیا ہے یہ بتانا خدا کا اختیار ہے۔ بڑی سخت تنبیہ کے ساتھ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (سورہ النحل، 16: 116)

تم اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اِس طرح اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو۔ (یاد رکھو) جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں گے، وہ ہرگز فلاح نہ پائیں گے۔

بات بات پر خدا کے ناراض ہو جانے کے اعلانات اور معمولی باتوں کو گناہ کے دائرے میں ڈالنے کا طرز بچوں کے ذہن میں خدا کا ایسا تصور پیدا کرتے ہیں جو ایک خشک مزاج مربی کی طرح خفا ہو جانے اور ایک اذیت پسند آقا کی طرح ہر وقت عذاب کا کوڑا برسانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں دین دار لوگ عموماً رحمت اور نرمی جیسے جذبات سے محروم اور خشک مزاجی کا نمونہ ہوتے ہیں۔

آداب کا تعلق تہذیبی روایات اور اقدار سے ہوتا ہے۔ ہر قوم انھیں اپنے نسلوں کو سکھاتی ہے۔ چھوٹی موٹی ناگوار اور خلاف ادب باتوں کی اصلاح کے لیے زبانی

نصیحت اور اپنا عملی نمونہ کافی ہوتا ہے، خدا کے نام پر جھوٹ باندھنے کی جسارت ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

شخصیت سازی اور ٹیلنٹ

منفرد شکل وصورت کی طرح ہر بچہ منفرد شخصیت اور خاص صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اسے دوسرے بچوں کی نقالی کرانے کی بجائے اس کی اپنی شخصیت کو پروان چڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔ دوسروں کی نقالی میں وہ اپنی شخصیت کھو دیتا ہے اور کوئی دوسری شخصیت بھی اپنا نہیں پاتا۔

قدرت بچے کی شخصیت کے بنیادی خدوخال اس میں ڈال کر بھیجتی ہے۔ اس شخصیت کو پروان چڑھانے میں والدین کو صرف سہولت کار کا کردار ادا کرنا چاہیے، اس کی شخصیت سازی نہیں کرنی چاہیے۔

بچہ اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری مواد اپنے ماحول سے لیتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے ماحول میں منفی رجحانات اور غیر صحت مندانہ رویے موجود نہ ہوں، اور اگر ہوں تو ممکنہ حد تک وہ ان سے متاثر نہ ہونے پائے۔

کسی گھرانے کے تمام بچے اگر تعلیمی یا فکری لحاظ سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے نظر آئیں تو یہ خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی انفرادی شخصیت کو پنپنے کا موقع شاید نہیں دیا گیا۔

شخصیت کی طرح بچے اپنی اپنی خاص صلاحیت یا ٹیلنٹ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کو مشاہدہ کرتے رہنا چاہیے کہ بچہ کس قسم کے طبعی رجحانات رکھتا ہے۔ کس مضمون یا کام میں زیادہ مہارت دکھاتا ہے، اس کام کو کرتے ہوئے اسے زیادہ دقت پیش نہیں آتی اور اس کی مشغولیت اسے لطف دیتی ہے۔ یہی اس کی فطری صلاحیت یا ٹیلنٹ ہے، یہی اس کا فطری میدانِ عمل ہے۔

بچے بعض اوقات اپنا فطری ٹیلنٹ غلط دریافت کر لیتے ہیں۔ کسی وقتی تاثر سے متاثر ہو کر وہ ایک کیریئر کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ جو میدان عمل وہ منتخب کرنا چاہتے ہیں اس میں ان کی کارکردگی کس درجے کی ہے۔ شوق اور ٹیلنٹ دو مختلف چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔

بچے کا ٹیلنٹ تعلیمی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر تعلیمی نوعیت کا بھی، جیسے کھیل، ہنر، کاروبار، فنون لطیفہ وغیرہ۔ بچے کا جو بھی ٹیلنٹ ہو اسی میں بچے کو آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔ اسی میدان میں اس کی کارکردگی کو جانچنا چاہیے۔ دیگر مضامین اور شعبوں میں اس کی کم کارکردگی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

انسان کا فطری ہنر اگر اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ بھی بن جائے تو دنیا میں اس سے بڑھ کر لطف اور مسرت کی کوئی چیز نہیں۔ اکثر اس کا نتیجہ کیریئر میں شان دار کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

بچوں کے خاص ٹیلنٹ کی دریافت اور نشوونما میں بہت دھیرج برتنا چاہیے، ورنہ اس کا ٹیلنٹ ابھرنے سے پہلے ہی دب کر مر سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے فرزند، جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ انھیں بچپن میں مصوری کا شوق تھا۔ علامہ اقبال کو توقع ہوئی کہ شاید وہ اچھے مصور بن سکتے ہیں۔ انھوں نے یورپ سے نامور مصوّروں کی

کچھ پینٹنگز منگوا کر انھیں دیں۔ انھیں دیکھ کر جاوید اقبال کا حوصلہ جواب دے گیا کہ وہ ایسے مصور کبھی نہیں بن سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مصوّری چھوڑ دی۔

بچوں پر اپنے ادھورے خوابوں اور اپنی توقعات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے، ورنہ ان کی صلاحیتیں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا سکتی ہیں۔ والدین کی توقعات کا بوجھ بچوں میں ذہنی دباؤ اور تناؤ پیدا کرتا ہے۔ ان توقعات کے ہاتھوں بعض طلبا ذہنی مریض بن جاتے یا تعلیم ترک کر بیٹھتے ہیں۔ کم نمبر آنے پر طلبا کی خودکشی کے مسلسل واقعات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اپنی توقعات اور حسرتوں کی تکمیل بچوں سے کرانے کی بجائے بچوں کو ان کے رجحانات کے مطابق جینے کا موقع فراہم کرنا ہی والدین کے کرنے کا اصل کام ہے۔

صلاحیتوں کا تنوع قدرت کی قوتِ تخلیق اور اس کی صفتِ جمال کا اظہار ہے۔ یہ تنوع زندگی کے حسن و ارتقا کا باعث ہے۔ اس سے متوحش ہونے کی بجائے، مختلف قسم کی صلاحتیوں کو نشو و نما پانے کے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔

بچوں کی ضروری فراغت

مشہور مقولہ ہے کہ فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے، لیکن ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی ذہانت کی نمو اور نمود کے لیے فراغت بہت ضروری ہے۔ عمدہ تخلیق کار خود کو باقاعدہ فراغت میں مبتلا کرتے ہیں تو ان کے ہاں نئے خیالات جنم لیتے ہیں۔

اب یہ چلن ہو گیا ہے کہ بچہ اسکول میں چھے، آٹھ گھنٹے گزار کر واپس آئے تو ٹیوشن پڑھنے بھیج دیا جائے، وہاں سے چھوٹے تو قاری صاحب اسے دھر لیں، اس کے بعد کچھ دیر ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ پر وقت بتائے اور پھر سونے چلا جائے۔ اس معمول میں بچے کی تخلیقی ذہانت کو سانس لینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مگر والدین مطمئن رہتے ہیں کہ انھوں نے بچے کو مصروف رکھ کر منفی سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے بچا لیا ہے، لیکن اس عمل میں بچے کی شخصیت میں ایک سطحی ذہن کے سوا کچھ نہیں بچتا، جس کا کام دوا اور دوچار کی طرح اپنی روٹین پوری کرنا ہوتا ہے۔

انھی وجوہات سے بچوں میں تفہیم، تنقید اور تخلیق کی صلاحیتوں کی شدید کمی نظر آتی ہے۔ بچپن کے زمانے میں نئی نئی باتیں اور سوال کرنے والے بچے، کسی نئی یا گہری بات کو سمجھنے، سوچنے، تجزیہ کرنے جیسی مشقت میں پڑنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی دل فریب نعرہ، کوئی مقبول بیانیہ، کوئی بے بنیاد افواہ انھیں کٹی پتنگ کی طرح اڑالے جاتے ہیں۔ کوئی نیا خیال ان کو نہیں سوجھتا۔ فکر و ہنر کی کوئی تخلیق ان سے صادر نہیں ہوتی۔ کچھ سخت جان پھر بھی ایسے نکل آتے ہیں، جو کچھ تخلیقات اور اکتشافات کر دکھاتے ہیں، لیکن وہ مستثنیات ہیں جو کسی تعلیمی نظام کے پروردہ نہیں ہوتے۔ وہ اس نظام کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایسے نظام کے باوجود پیدا ہو جاتے ہیں۔ کچھ وقت فارغ رہنے سے بچوں کے ذہن میں زندگی اور مذہب وغیرہ سے متعلق سوال ابھرنے لگتے ہیں۔ ان سوالات کو ہمارے ہاں شیطانی وساوس کہ کر حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ وہ فطری سوالات ہیں جو ہر سوچنے والے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ علم اور حق کی جستجو کے فطری داعیات کی وجہ سے پیدا ہوتے

ہیں۔ انھیں شیطان سے منسوب کرنا غلط فہمی بھی ہے اور بد ذوقی ہے۔ ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینے کے لیے والدین اور اساتذہ کو خود بھی علمی اور فکری تیاری کرنی چاہیے ۔ تاہم، یہ بھی درست نہیں کہ بچوں کو ان کے تمام سوالات کے تیار جوابات دے دیے جائیں۔ انھیں خود غور وفکر سے جواب تلاشنے کا موقع اور ترغیب دینی چاہیے۔ فوری جوابات ملنے سے ان کی فکری نشوونما پوری طرح پروان نہیں چڑھتی اور سہل انگاری بھی پیدا ہوتی ہے۔

فراغت کا مطلب یہ نہیں کہ بچے ٹیب یا موبائل فون لے کر بیٹھ جائیں۔ کسی وقت ان سے پڑھائی، ٹی وی، فون وغیرہ سب چھڑوا کر مکمل طور پر فارغ کر دینا چاہیے۔ کچھ بڑے بچوں کو یہ مشورہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ وہ پیدل یا سائیکل وغیرہ پر کبھی لمبی سیر کو نکل جایا کریں یا گھر ہی میں کچھ وقت صرف اپنی ذات کے ساتھ گزارا کریں۔ ان میں اگر کوئی تخلیقی صلاحیت ہو گی تو انھیں خود بتا دے گی کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔

نصیحت آمیز لیکچرز

بچوں میں مطلوب رویہ پیدا کرنے کے لیے سب سے موثر چیز ان کا ماحول اور والدین کا عملی رویہ ہے۔ جو چیز عملی رویوں سے منتقل ہوتی ہے وہ زبانی تلقین سے نہیں ہوتی۔ کچھ مواقع پر بچوں کو نصیحت کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، لیکن حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ نصیحت کو باقاعدہ لیکچر کی شکل نہ دے دی جائے۔ بغیر موقع کے لیکچر جھاڑنا تو سرے سے مفید ہی نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بھوک سے پہلے کھانا پیش کر دیا جائے۔ باقاعدہ پند و نصائح جب مخاطب کی مرضی کے خلاف کیے جارہے ہوں تو فائدہ مند ہونے کی بجائے سامع میں گریز کا رویہ پیدا کرتے ہیں۔

بچوں کو نفرت کی تعلیم

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دوسروں کے بارے میں بہت سے گمانوں سے بچو، کچھ گمان گناہ ہوتے ہیں[32]۔

بسا اوقات دوسروں سے نفرت بلکہ محبت بھی محض بے حقیقت گمان کی بنا پر کی جاتی ہے۔ پھر یہ گمان ورثے کی صورت میں اگلی نسل کو منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بچوں میں تنقیدی شعور پیدا نہیں ہونے دیتا۔ ہر فرد کا یہ حق ہے کہ وہ

[32] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ(الحجرات،12:49)

ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، اِس لیے کہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں۔ اور (دوسروں کی) ٹوہ میں نہ لگو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ سو اِسے تو گوارا نہیں کرتے ہو، (پھر غیبت کیوں گوارا ہو)! تم اللہ سے ڈرو۔ یقیناً، اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔

وراثت میں ملے تصورات، اعتقادات اور وابستگیوں کے بارے میں اپنے شعور اور تجزیے کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔

کٹر نظریاتی اور متعصب والدین اپنے بچوں پر ذہنی تشدد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ ان کی تجزیاتی صلاحیت کو بچپن ہی میں ختم کر ڈالتے ہیں۔

والدین کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے بچوں کو اپنی نظریاتی، مذہبی، سیاسی یا مسلکی وابستگیوں کا اسیر بنا دیں اور اس کے لیے انھیں کسی تکلیف میں ڈالیں، انھیں احتجاجی یا ماتمی جلسوں میں خوار کریں۔ برستی لاٹھیوں اور گولیوں کے آگے ڈھال بنا لیں اور پھر اس پر ماتم کی سیاست کریں۔ یہ والدین اپنے بچوں کے قاتل اور مجرم ہوتے ہیں۔ اپنی جذباتی حماقت کو بچوں کی طرف سے قربانی کا عنوان دے کر چھپایا نہیں جا سکتا۔ بچوں کے اس استحصال پر والدین سزا کے مستحق ہیں۔ اس مسئلے پر قانون سازی کی ضرورت ہے۔

سیاست، مذہب اور سماج میں گروہی سطح پر دوسروں سے نفرت گروہی مفادات کی خاطر پیدا کی جاتی ہے۔ عام آدمی پراپیگنڈا کے اثر سے اس نفرت کا اسیر ہو جاتا اور تاثر کو حقیقت باور کر لیتا ہے۔ اس کے ووٹ اور پیسے کو سیاسی، مذہبی اور گروہی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے، مگر خوف اور ہیجان کی مصنوعی حالت دور ہوتے ہی یہ دوبارہ عام آدمی بن جاتا ہے، جس کی اولین ترجیح اپنی اور اپنے خاندان کی بہبود ہوتی ہے۔

ہمیں یہ حقیقت باور کرنے اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے سماجوں میں سیاسی اور گروہی تعصبات سے غیر وابستہ عام افراد ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔ بنیادی انسانی احساسات اور اقدار کے معاملے میں مختلف سماجوں کی یہ اکثریت کم و بیش یکساں رویوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہ نفرت اور جنگ کے کھیل کا حصہ بننا پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک عام آدمی کی پر امن اور مفید زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی لوگ سماج کی بنیاد اور اس کی حقیقی پہچان ہوتے ہیں۔ یہ کسی خبر

کا حصہ نہیں بنتے، کیوں کہ یہ معمول کے کام کرتے ہیں، جب کہ خبر غیر معمولی واقعے سے بنتی ہے۔ کاروبارِ حیات معمول کے کاموں سے چلتا ہے۔ دنیا کے ہر سماج میں ہر لحظہ معمول کے ہزاروں لاکھوں واقعات نہ ہو رہے ہوں تو نظام حیات یک لخت تلپٹ ہو کر رہ جائے۔ عام لوگوں کی معمول کی معاشی اور سماجی سرگرمیاں ہی ہیں جن کے بل پر کچھ لوگ غیر معمولی کام کر کے نمایاں ہوتے ہیں۔

قوموں کی تاریخ اور ان کے درمیان تعلقات کے مطالعے میں اس نکتے کو نہ سمجھنے سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ سیاست اور سیاسی تاریخ چن چن کر معمول سے ہٹ کر ہونے والے واقعات سے نفرت کا بیانیہ تشکیل دیتی اور ان ہزاروں لاکھوں واقعات کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے جن میں سماجی سطح پر انسانیت اور بقائے باہمی کا ثبوت ہر لحظہ ملتا ہے۔

سیاسی اقلیت جو منظم ہو کر کاروبارِ سیاست و حکومت سنبھالتی ہے، اسے عام آدمی کی اس اکثریت کی ترجیحات کو اپنا منشور بنانا چاہیے جو دوسرے گروہوں اور دوسری

قوموں سے لڑائی جھگڑوں سے دور، نظریاتی کشمکش سے بے پروا، اپنی اور اپنے خاندان کی بہبود کو تمام چیزوں پر ترجیح دیتا ہے۔

جمہوریت میں ووٹ کے ذریعے سے عام لوگوں کی اس پرامن اکثریت کے پاس موقع ہے کہ وہ خود کو دوسروں کے گروہی مفادات اور رقابتوں کی بھینٹ نہ چڑھنے دے۔ اپنے خرچ پر اپنی تباہی کا سودا نہ کرنے دے۔ وہ اہل حکم کو مجبور کر دے کہ وہ ان کی بہبود کے ایجنڈے پر عمل کریں۔ نفرت کا کاروبار اِن کا مفاد نہیں، یہ جن کا مفاد ہے، ان پر عوامی احتساب کی کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

حد سے بڑھی ہوئی شرم وحیا

ہمارے سماج میں بالغ ہوتے بچوں کے ساتھ جنسی آگہی کے لیے گفتگو کرنا شرم وحیا کے تقاضوں کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ شرم وحیا کے نام پر ان حقائق سے نظریں چرانے کا یہ رویہ بڑے مسائل کا باعث بنتا ہے۔

جنسی رجحانات بلوغت سے پہلے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ان کو معمول کا عمل سمجھنا چاہیے۔ ان کے بارے میں آگاہی بھی معمول کے انداز ہی میں دینی چاہیے۔ دھیرے دھیرے اس کی نزاکتوں کے بارے میں آگاہ کرنا چاہیے۔ اسے پراسرار اور خوف ناک بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ بلوغت کو ایسے ہی خوش آمدید کہنا چاہیے جیسے ہم بچوں میں دیگر مثبت تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی کامیابیوں کو سراہتے ہیں۔

مساجد بچوں کی منتظر ہیں

بچپن میں مجھے گھر سے تلقین کی جاتی کہ نماز مسجد میں پڑھوں، لیکن اپنی حساس طبیعت کی وجہ پر مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی مجھے بچہ دیکھ کر پچھلی صفوں میں دھکیل دے کہ نابالغ بچے کے پیچھے بالغ کی نماز نہیں ہوتی! اور میں شرم سار ہو کر رہ جاؤں۔ چنانچہ مسجد میں نماز پڑھنے سے میں کتراتا تھا۔ اس پر گھر سے ڈانٹ الگ پڑتی تھی۔

آخر ایک دن اللہ تعالی سے عہد کیا کہ آج مسجد جاتا ہوں، لیکن کسی نے مجھے میری جگہ سے ہٹایا، تو میں پھر کبھی مسجد کا رخ نہیں کروں گا!

اب میں مسجد میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نمازِ عصر کا وقت تھا۔ نماز شروع ہونے سے پہلے میں پیچھے بیٹھا صف بندی کا منتظر تھا۔ ابھی ایک ہی صف بنی تھی۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور صف میں انتہائی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب نے تکبیرِ کہی۔

میں نے نماز شروع کرنے میں کچھ تاخیر کی۔ کنکھیوں سے پیچھے مڑ کے دیکھا کہ کسی اور کو آنا ہے تو آجائے، تاکہ پھر مجھے نہ ہٹائے۔

اتنے میں ایک صاحبِ ریش وارد ہوئے۔ لمبی کالی داڑھی سے ٹپکتے پانی کے قطرے اور ٹخنوں سے اوپر پائنچے۔ شکر کیا کہ نماز شروع نہ کی تھی ورنہ ان صاحب نے تو کھینچ کر پرے کر دینا تھا۔ میں نے ان کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی، لیکن پھر وہ ہوا جس کا گمان بھی نہ تھا۔ انھوں نے بڑے پیار سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے میری ہی جگہ کھڑا کر دیا اور خود میرے دائیں جانب کھڑا ہو گئے!

خود کو نمازیوں کے درمیان کھڑا پا کر مجھے جو خوشی، اطمینان اور عزت محسوس ہوئی، اس نے مجھے وہ اعتماد اور حوصلہ دیا کہ میں باجماعت نمازی بن گیا۔ میں آج تک اس شخص کا یہ احسان نہیں بھولا۔ خدا نے ایک بچے کی دعا کی لاج رکھ لی تھی۔

ہمارے ہاں مساجد میں بچوں کو پچھلی صفوں میں رکھنے کو شرعاً لازم سمجھنا اور یہ تصور کرنا کہ بچوں کی نماز نفل ہے اس لیے بالغوں کی فرض نماز ان کے پیچھے نہیں

ہوتی، یہ کم علم خطیبوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں ہے۔ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ صفوں میں بچوں کو کس جگہ کھڑا کرنا ہے، یہ انتظامی معاملہ ہے، شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تجویز کرتے ہیں کہ بچوں کو ان کے بڑے اپنے ساتھ کھڑا کرلیں تو یہ زیادہ بہتر ہے، بنسبت اس کے سب بچے پچھلی صفوں میں اکٹھے ہو کر شرارتیں کریں۔[33]

---

[33] اس سلسلے میں درج ذیل فتاوی دیکھے جاسکتے ہیں:

1۔ دارالعلوم دیوبند (ہند):

"ثم الترتیب بین الرجال والصبیان سنة، لا فرض، ہو الصحیح. (غنیة المستملی ص:۴۸۵، انوار المحمود،ج:۱،ص:۲۴۵)

"پھر مردوں اور بچوں (کی صفوں) میں ترتیب سنت ہے، فرض نہیں ہے، یہی مفتی بہ قول ہے۔"

2۔ اس بارے میں مفتی عمر فاروق لوہاروی، شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یو. کے):

"جماعت میں ایک سے زائد بچے ہونے کی صورت میں بچوں کی صف کو مردوں کی صف کے پیچھے بنانے کا یہ حکم اس وقت ہے، جبکہ مسجد میں آنے والے بچے باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ اور سلیقہ مند ہوں، مسجد میں شرارتیں نہ کریں، شور نہ مچائیں، اور احترامِ مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی سے نماز ادا کریں؛ لیکن اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو، اور ان کی علیحدہ صف بنانے میں نماز کے اندر شرارتیں کرنے اور اپنی نماز کو باطل کرنے یا ان کے کسی طرزِ عمل اور شرارت سے مردوں کی نماز باطل ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو، تو پھر ان کی الگ صف نہ بنائی جائے؛ بلکہ ان کو منتشر اور متفرق طور پر مردوں کی صفوں میں کھڑا کرنا چاہیے، نیز بچوں کو مردوں سے علیحدہ کھڑا کرنے میں اجتماعِ عظیم اور مجمع

کثیر کی بناء پر بچوں کے گم ہو جانے یا اغوا ہونے یا اور کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو، تو بچوں کو اپنے ساتھ مردوں کی صف میں متفرق طور پر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔"

فتوے کا لنک

http://darululoom-deoband.com/urdu/articles/tmp/1428729654%2004Bachchon%20Ko%20Badon%20Ki%20Saf_MDU_09_September_2007.htm

3۔ دارالافتاء تحریک منہاج القرآن کا فتویٰ یہ ہے:

"بچوں کو اگلی صف میں اپنے ساتھ کھڑا کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ:

"عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ جَدَّتَهُ مُلَيْكَةَ دَعَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَتْهُ لَهُ فَأَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قُومُوا فَلِأُصَلِّ لَكُمْ قَالَ أَنَسٌ فَقُمْتُ إِلَى حَصِيرٍ لَنَا قَدْ اسْوَدَّ مِنْ طُولِ مَا لُبِسَ فَنَضَحْتُهُ بِمَاءٍ فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَفَفْتُ وَالْيَتِيمَ وَرَاءَهُ وَالْعَجُوزُ مِنْ وَرَائِنَا فَصَلَّى لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفَ" (صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، 380)

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انکی دادی ملیکہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھایا اور پھر فرمایا: اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک چٹائی کی طرف بڑھا جو پرانی ہونے کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھی۔ میں نے اس پر پانی چھڑکا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور میں نے اور ایک چھوٹے بچے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف بنائی، اور بڑھیا ہمارے پیچھے تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھائیں پھر آپ تشریف لے گئے۔

"اس حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ چھوٹا بچہ پہلی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ تاہم اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ بچے اتنے چھوٹے نہ ہوں کہ مسجد میں پیشاب کر دیں۔ اگر بچہ اتنی سمجھ بوجھ رکھتا ہے کہ اس کو مسجد کے آداب کا خیال ہے تو ان کو ضرور ساتھ لے کر جائیں اور اپنے ساتھ صف میں کھڑا کریں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اگر بچوں کو اکٹھا ایک ہی صف میں کھڑا کیا جائے تو زیادہ شور شرابا اور جھگڑا کرتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انہیں اپنے ساتھ کھڑا کیا جائے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔"

مفتی: عبدالقیوم ہزاروی

فتویٰ کا لنک:

http://www.thefatwa.com/urdu/questionID/3417/%DA%A9%DB%8C%D8%A7-%D8%A8%D8%A7%D8%AC%D9%85%D8%A7%D8%B9%D8%AA-%D9%86%D9%85%D8%A7%D8%B2-%D9%85%DB%8C%DA%BA-%D8%A8%DA%86%D9%88%DA%BA-%DA%A9%D9%88-%D8%A2%D8%AE%D8%B1%DB%8C-%D8%B5%D9%81-%D9%85%DB%8C%DA%BA-%DA%A9%DA%BE%DA%91%D8%A7-%DA%A9%D8%B1%D9%86%D8%A7-%D8%B6%D8%B1%D9%88%D8%B1%DB%8C-%DB%81%DB%92/

کم سن بچوں کی مسجد میں آمد پر بعض لوگوں کا شور مچانا جہالت پر مبنی حساسیت ہے۔ ہمیں علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بہت کم سن بچے بھی مسجد میں لائے جاتے تھے۔ دورانِ نماز میں کوئی بچہ رونے لگتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے نماز مختصر فرما دیتے تھے کہ بچے کی ماں کو پریشانی ہو رہی ہو گی۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ کے نواسے، حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اپنی کم سنی میں لڑکھڑاتے قدموں سے مسجد میں داخل ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ شفقت سے بے تاب ہو کر خطبہ بیچ میں چھوڑ کر ان کو گود میں اٹھا لائے۔

اسوہءِ حسنہ کے اس آئینے میں مساجد میں بچوں کی آمد کے خلاف پائے جانے والے رویے کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں مساجد میں نماز اور ناظرہ قرآن پڑھانے کے علاوہ کوئی ایسی سرگرمی عموماً پائی نہیں جاتی، جس میں بچے خوشی سے حصہ لیں اور یوں مسجد سے اپنا تعلق

استوار کریں۔ کم از کم کشادہ مساجد میں بچوں کی دلچسپی کے کھلونے، کھیل کود اور لکھنے پڑھنے کا سامان اور لائبیری ہونی چاہیے تاکہ بچے والدین کی نماز کے دوران میں وہاں وقت گزاریں، مسجد کے ماحول سے مانوس ہو جائیں اور نمازیوں کی دیکھا دیکھی نماز بھی سیکھ لیں۔

کیا ہم نہیں چاہتے کہ ہماری آیندہ نسلوں کا تعلق مسجد سے جڑا رہے؟

حج و عمرہ میں بچوں کو ساتھ لے جانا

تمام تر ممکنہ سہولیات کے باوجود بیت اللہ کا حج و عمرہ ایک مشقت طلب کام ہے اور اس بنا پر یہ وہی کر سکتا ہے جو اسے ایمان اور اسلام کا تقاضا سمجھتا اور دین کے ساتھ شعوری اور جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔

دیکھنے میں آتا ہے لوگ اپنے کم سن بچوں کو بھی سعادت سمجھ کر اس میں شریک کر لیتے ہیں جنھیں یہ شعور نہیں ہوتا کہ انھیں کیوں یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر بعد ہی وہ تنگ پڑ جاتے ہیں اور پھر احتجاج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ والدین کی عبادت بھی مکدر ہوتی ہے اور ساتھ والوں کی بھی۔

کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے ورنہ کم سن بچوں کے ساتھ حج و عمرہ کرنا کوئی معقول بات نہیں۔

بچپن کے تاثرات بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ان مقدس مقامات کے سفر اور زیارت کے دوران میں ناگوار تجربات کی یاد ان پر دیرپا منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس اگر اپنے بچوں کو اپنی حج و عمرہ کے تجربات اور واقعات سنائے جائیں، خواہ اپنی مشقت کا ذکر بھی کیا جائے تو بچوں میں اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی ان مقامات کو دیکھیں خواہ انھیں بھی وہ مشقتیں کیوں نہ اٹھانا پڑیں جن سے ان کے بڑے گزرے۔

حصہ سوم: فقہی مقالات

خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت

اولاد پیدا کرنا فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ تاہم، اسلام نے اولاد پیدا کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا، کیوں کہ یہ حکم دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک ارشاد سے زیادہ بچے پیدا کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے۔

یہ ارشاد یوں نقل ہوا ہے

تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ، إِنِّي مُكَاثِرٌ الْأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (مسند أحمد، رقم: 12613)[34]

"ایسی عورت سے نکاح کرو جو محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو، بے شک میں قیامت کے دن انبیاء کے مقابلے میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔"

رسول اللہ ﷺ کا ہر ارشاد دین کا مطالبہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ لوگوں کے حالات کے مطابق مشورے بھی دیتے تھے اور بطورِ سربراہِ ریاست انتظامی امور سے متعلق ہدایات بھی جاری کیا کرتے تھے۔

---

[34] علامہ شعیب الارناؤوط نے اسے صحیح لغیرہ اور قوی الاسناد قرار دیا ہے۔

آپؐ کا یہ ارشاد محض زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب نہیں، بلکہ قابلِ فخر بچے پیدا کرنے کی تلقین ہے، اور قابلِ فخر بچے وہی ہو سکتے ہیں جن کی اچھی تعلیم و تربیت کرنا والدین کے لیے ممکن ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی تعداد والدین کے وسائل کے مطابق ہو۔

کثرتِ اولاد سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپؐ کے وقت میں درپیش حالات کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبائلی معاشرت میں کھڑے تھے، جہاں افرادی قوت کی بہت اہمیت تھی۔ ادھر مسلمانوں کی مختصر تعداد اپنے سے کئی گنا بڑے دشمنوں سے نبرد آزما تھی، مستقبل میں روم و ایران سے جنگیں پیش آنا بھی آپؐ کے علم میں تھا۔ ادھر مدینے کے معاشی حالات بہتر ہو رہے تھے۔ مختلف فتوحات کے نتیجے میں مالِ غنیمت اور خراج وافر مقدار میں آنے لگے تھے۔ ان حالات میں آبادی بڑھانے کی ترغیب برمحل تھی۔ لیکن اسے ہر گھرانے، ہر دور اور ہر سماج کے لیے ایک مستقل اور مطلق دینی ہدایت سمجھ لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آج بھی حکومتیں جس طرح حالات کے پیشِ نظر لوگوں کو کم بچے پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہیں، اسی طرح حالات اگر تقاضا کریں تو آبادی بڑھانے کی ترغیب بھی دے سکتی ہیں۔

قرآن مجید اولاد اور کھیتی کا تقابل کر کے یہ رہنمائی کرتا ہے کہ اولاد ہو یا کھیتی اس کا پیدا کرنا خدا ہی کا کام ہے، مگر اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ کھیتی کی طرح اولاد کو بھی پیدا کرنے سے پہلے وہ تمام منصوبہ بندی کر لینی چاہیے جو ایک کسان فصل بونے سے پہلے کرتا ہے۔

آیات ملاحظہ کیجیے:

أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ [واقعہ، 58-59)

پھر کبھی سوچا ہے، یہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو، اُس سے جو کچھ بنتا ہے، اُسے تم بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (واقعہ، 63-64)

پھر تم نے کبھی سوچا ہے، یہ جو کچھ تم بوتے ہو، اِسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟

خدا پر بھروسے کا یہ مطلب نہیں کہ فصلیں اندھا دھند اگا لی جائیں اور پھر ناقص منصوبہ بندی کی نذر کر دی جائیں۔ اسی طرح اولاد کو بھی بغیر کسی منصوبہ بندی کے پیدا کر لینا ایک غیر معقول عمل ہی کہلائے گا۔ یہ دونوں عمل ایک ہی اصول پر مبنی ہیں کہ کوشش اور منصوبہ بندی کرنا انسان کا کام ہے، اس میں اسے کوتاہی نہیں برتنی چاہیے، باقی سب خدا کی قدرت پر منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عزل[35] سے منع نہیں کیا[36]، جو خاندانی منصوبہ بندی ہی کی ایک تدبیر ہے۔ اس بارے میں ایک غلط فہمی صحیح مسلم کی ایک روایت سے پیدا ہوتی ہے جس میں عزل کو "وادٌ خفیٌ" (بچے کو پوشیدہ طور پر زندہ در گور کرنا) کہا گیا ہے۔

روایت یہ ہے:

سَأَلُوهُ عَنِ الْعَزْلِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «ذَلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ (صحیح مسلم، رقم:1442)

لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہ یہ واد خفی ہے۔

یہ روایت ان کثیر اور مستند روایات کے خلاف ہے جس میں عزل کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ عمل اگر ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ خوش قسمتی سے ترمذی کی ایک روایت، روایات کے اس تناقض کو حل کر دیتی ہے۔ اس روایت کے مطابق عزل کو بچے کے قتل کے مترادف سمجھنا دراصل یہود کا تصور تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس تصور کی نفی فرمائی تھی:

---

[35] جماع کے عمل میں بوقتِ انزال مرد کا اپنا مادہءِ تولید عورت کے رحم کے باہر خارج کرنا۔

[36] دیکھیے، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب العزل۔

روایت یہ ہے:

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، إِنَّا كُنَّا نَعْزِلُ، فَزَعَمَتِ اليَهُودُ أَنَّهَا الْمَوْءُودَةُ الصُّغْرَى، فَقَالَ: كَذَبَتِ اليَهُودُ، إِنَّ اللَّهَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَخْلُقَهُ فَلَمْ يَمْنَعْهُ[37]

حضرت جابر سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہود کہتے ہیں کہ عزل بھی ایک چھوٹی قسم کی موءودۃ (یعنی بچی کو زندہ در گور کرنا) ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ”یہود جھوٹے ہیں۔ اگر اللہ کسی کو پیدا کرنا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت میں جو بات رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ در حقیقت یہود کا موقف تھا، مگر راوی کے تصرُّف نے اسے رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیا۔

---

[37] سنن الترمذي، رقم:1136

خدا کی رزاقیت اور بچوں کی پیدائش

رزق کے مفہوم میں وہ تمام ضروریاتِ زندگی شامل ہیں، جن کے بغیر زندگی ممکن اور سہل نہیں ہوتی۔ رزق کا معاملہ بھی آزمایش کی اسی اسکیم کے تحت ہے، جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو تخلیق کیا ہے۔ یہاں قسمت اور کوشش کے باہمی تعامل سے نتائج مرتب ہوتے ہیں، جن کا ایسا کوئی لگا بندھا اصول نہیں ہوتا کہ یقینی نتائج کی ضمانت دی جا سکے۔ انسان کی ہر کوشش بار آور ہوتی ہے اور نہ قسمت کی یاوری کا کوئی مستقل قاعدہ ہے۔ اللہ کی مدد اپنی حکمت کے تحت شاملِ حال ہوتی ہے، تو انسان کامیاب ہو جاتا ہے، اس کی حکمت کا تقاضا ہو تو نتائج حسبِ توقع نہیں نکلتے۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ کوشش کرے، چنانچہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے محنت کی جائے تو مثبت نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، درحقیقت، نیک و بد اعمال کے اخروی نتائج کو بیان کرتا ہے۔ اس آیت کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو اس کا یہ مفہوم از خود واضح ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ (نجم،53: 38-40)

یہ کہ کوئی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کو آخرت میں وہی ملے گا جو اُس نے دنیا میں کمایا ہے اور یہ کہ جو کچھ اُس نے کمایا ہے، وہ عنقریب دیکھا جائے گا، پھر اُس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالی نے سب جان داروں کے رزق کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے، اس لیے سب کو ان کا ضرور رزق ملے گا۔

آیت یہ ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (هود، 11: 6)

زمین پر چلنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ اور وہ اُس کے ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور

اُس جگہ کو بھی جہاں وہ (مرنے کے بعد زمین کے) سپرد کیا
جائے گا۔ یہ سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ رزق کو اپنی ذمہ داری بتایا ہے، ترسیلِ رزق کی ضمانت نہیں دی۔ یعنی اس نے جو بھی جان دار پیدا کیے ہیں، ان کے لیے رزق بھی پیدا کیا ہے، مگر ہر جان دار تک اس کے رزق کی ترسیل بھی ہو گی، اس کا ذمہ نہیں لیا۔

قرآن مجید کی جس آیت سے اللہ تعالی کی طرف سے ترسیلِ رزق کے بھروسے پر بے دریغ اولاد پیدا کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے، درحقیقت وہی آیت اس فہم کی نفی کرتی ہے۔

آیت یہ ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ
إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا [اسراء، 17: 31]

تم لوگ اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم
اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ اُن کا قتل یقیناً
بہت بڑا جرم ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمھیں بھی"، ان مفلس والدین کو مخاطب کرتا ہے، جن کی تنگ دستی انھیں اپنے جگر پاروں کو قتل کر دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ والدین خود بھی کسی کی اولاد ہی تھے، مگر ان کو بھی بقدرِ ضرورت رزق نہیں ملا۔

اس آیت کا درست مفہوم یہ ہے کہ وہ بچے جو دنیا میں وارد ہو چکے، انھیں اب مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کیا جائے۔ یہ ایک بڑا جرم ہے۔ جیسی کچھ روزی ان والدین کو ملتی ہے، انھیں بھی مل سکتی ہے، ان سے بہتر یا کم تر بھی۔ ان کی قسمت کا فیصلہ اب قدرت پر چھوڑ دیا جائے۔

وسائل کی کم یابی کے باوجود اپنی استطاعت سے زیادہ بچے پیدا کرنا کوئی معقول بات نہیں۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جاتے ہیں۔ وسائل دیکھ کر ہی بچوں کو پیدا کرنے کی تمہید باندھنی چاہیے۔ وسائل کی کمی کے باوجود بچے پیدا کرنا، انھیں جانتے بوجھتے مشکلات کی نذر کر دینا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اولاد کو پالنا ایسے والدین کا اولاد پر کوئی احسان نہیں، بلکہ اپنی مجرمانہ غفلت کی تلافی کی ناکافی کوشش ہے۔

وسائل کی کم یابی کے ہاتھوں نامناسب خوراک اور علاج معالجہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے جو بچے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں، ان کے والدین قتلِ اولاد کے اسی جرم

کے مرتکب ہوتے ہیں، جس سے مذکورہ آیت میں روکا کیا گیا ہے۔ اور خدا کے ہاں ہر جرم کا حساب دینا ہو گا۔

معاشرے کی معاشی صورت حال جب تک بہتر نہیں ہو جاتی، زیادہ بچے پیدا کر کے اپنے بچوں اور معاشرے دونوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا کوئی معقول طرز عمل نہیں۔ محنت کشوں کو کم تر اجرت پر مجبور کرنا بھی اسی لیے ممکن ہوتا ہے کہ ان کی رسد ان کی طلب سے زیادہ ہے۔

غربت کی چکی میں پسنے والے لاکھوں کروڑوں بچوں میں سے چند ایک کی قسمت اگر چمک اٹھتی ہے، تو انھیں بطور مثال پیش کر دیا جاتا ہے کہ خدا چاہے تو یوں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے زیادہ بچے پیدا کرنے میں تردد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس، دیکھا جا سکتا ہے کہ عام معمول کے مطابق لاکھوں کروڑوں مفلسوں کے ہاں کوئی چمت کار نہیں ہوتا۔ خوش حالی سے بد حالی میں مبتلا ہو جانے والوں کی ان گنت مثالیں بھی موجود ہیں، ان سے عبرت کیوں حاصل نہ کی جائے؟ منفرد اور غیر معمولی واقعات سے عمومی کلیے نہیں بنائے جاتے۔ افراد کی اکثریت کو عمومی حالات ہی پیش آتے ہیں۔ چمت کار کی امید پر کوئی کام نہیں کیا جاتا چہ جائیکہ کہ جیتے جاگتے انسانوں کو پیدا کرنے کا سنجیدہ کام ایسی غیر سنجیدگی سے کیا جائے۔

کسی بھی دوسری شے کے مقابلے میں انسان سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی پیدایش کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جائے۔ اس کے بعد خدا پر بھروسہ کیا جائے۔ خدا پر توکّل کرنے کا یہی درست طریقہ ہے۔

حرمتِ زنا کی بنیاد: خاندان کا تحفظ

حرمتِ زنا کی بنیاد خاندان کے ادارے کا تحفظ ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق سے خاندان کا ادارہ وجود پذیر ہوتا ہے، جہاں انسان پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں۔ ایک ناتواں بچے کی نگہ داشت اور بڑھاپے کی لاچارگی میں انسان کی دیکھ بھال اپنے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے ساتھ صرف نسبی تعلقات کی فطری محبت اور توجہ ہی سے ممکن ہے۔ اس لیے خاندان کے ادارے کا تحفظ ضروری ہے۔ اس کے تحفظ کی خاطر یہ ضروری ٹھیرا کہ جنسی رجحان کے فطری داعیے کو شوہر اور بیوی کے درمیان محدود کر دیا جائے۔ جنسی دل چسپی گھر سے باہر بھی اگر بھٹکتی رہے، تو بچوں کی درست پرورش کے لیے درکار توجہ دستیاب نہیں ہو سکتی۔ خاندان متاثر ہو گا تو فرد اپنا صحت مند وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ فرد کی ان ضرورتوں کے پیشِ نظر شوہر اور بیوی کی باہمی وفاداری کو رشتہءِ نکاح کی لازمی قدر

کے طور پر باور کرایا گیا، بلکہ جنسی بے قیدی کو غیر پاکیزہ (فاحشہ) قرار دے کر قابل سزا جرم بنا دیا گیا۔

جنسی رویے کی تہذیب یقینی بنانے کے لیے قبل از نکاح جنسی تعلقات قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی، بلکہ اسے قابلِ سزا جرم بھی قرار دیا گیا، کیوں کہ ایک بار جنسی آوارگی کی عادت پڑ جائے تو بعد ازاں یہ شریکِ حیات اور بچوں کی حق تلفی کی بنیاد بن جاتی ہے۔

زنا اُن بچوں کی حق تلفی کا باعث بھی بنتا ہے، جو نکاح کے تعلق سے وجود میں آئے، اور انھیں اپنے باپ یا ماں یا دونوں کی جنسی آزاد روی کی وجہ سے ان کی مکمل توجہ میسر نہیں آسکتی، اور اُن بچوں کی حق تلفی کا باعث بھی بنتا ہے، جو زنا کے تعلق سے وجود میں آ گئے اور انھیں اپنے ماں اور باپ کی مستقل باہمی توجہ اور احساسِ ذمہ داری میسر نہیں آسکتے، کیوں کہ ان کے والدین کے درمیان مستقل رفاقت کے ارادے سے باندھا گیا معاہدہءِ نکاح نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ مستقل رفاقت کے ارادے کی شق کے بغیر نکاح در حقیقت نکاح ہی نہیں، کیوں کہ اس میں ممکنہ طور پر وجود پذیر ہونے والے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی باہمی نگہ داشت کی ضمانت دستیاب نہیں ہوتی، جو نکاح سے مقصود ہے۔ نکاحِ متعہ کی حرمت کی یہی حقیقت ہے۔

اسی چیز کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (النساء،4:24)

(اُن عورتوں کا مہر ادا کرکے) اپنے مال کے ذریعے سے اُنھیں حاصل کرنا تمھارے لیے حلال ہے، اِس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو نہ کہ بدکاری کرنے والے۔

فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ (النساء،4:25)

سو اُن (لونڈیوں) کے مالکوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرلو اور دستور کے مطابق اُن کے مہر بھی اُن کو دو، اِس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔

ان آیات میں نکاح کے درست ہونے کی لیے دو شرائط بیان ہوئی ہیں۔ ایک 'احصان'، یعنی کسی کو اپنی حفاظت میں لینا یا کسی کی حفاظت میں آجانا۔ یہ نکاح میں دوسرے فریق کی ذمہ داری اٹھا لینے یا اس کی ذمہ داری میں آجانے کا نام ہے۔ دوسرے 'غیر مسافحت'، یعنی جنسی تعلق محض جنسی تسکین کے لیے نہ ہو۔ زنا اور متعہ دونوں میں جنسی تسکین کے ساتھ مستقل رفاقت اور ذمہ داری کا فقدان ہوتا ہے، اس وجہ سے زنا کے علاوہ نکاح متعہ بھی حرام ہے۔ مغربی تہذیب میں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے تعلق میں بھی مستقل رفاقت کے معاہدے کی عدم موجودگی ان کے تعلق کو ناجائز بنا دیتی ہے۔

مستقل رفاقت کے نکاح میں بھی طلاق کا امکان موجود ہوتا ہے، مگر فرق یہ ہے یہاں طلاق اتفاقی معاملہ ہے، ارادے میں شامل نہیں ہوتا۔ نیز طلاق کی صورت میں تعلق کھڑے کھڑے ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب کہ نکاح متعہ میں علیحدگی کا عنصر پہلے سے موجود ہوتا ہے، پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش کے لیے والدین کی باہمی توجہ کی ضمانت نہیں ہوتی اور گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے تعلق کے خاتمے میں کوئی رسمی پابندیاں حائل نہیں ہوتیں۔

جنسی تعلق میں بچے کی پیدائش کے امکان کو اگر معدوم کر بھی لیا جائے، تو بھی وقتی نکاح یا نکاح کے بغیر جنسی تعلق جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ اِنھیں مرد و عورت نے کبھی نہ کبھی مستقل رفاقت کے ارادے سے گھر بسانا ہے۔ جنسی آزاد روی کی عادت اور خاندان کے تحفظ کا وہی مسئلہ یہاں پھر لوٹ آتا ہے۔

ایسے افراد جو اولاد کی خواہش نہ رکھتے ہوں، انھیں بھی جنسی آزادروی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے کہ اول تو ایسے لوگ مستثنیات ہوتے ہیں، اور عمومی قوانین مستثنیات کی رعایت سے نہیں بنائے جاتے، انھیں بھی عمومی قوانین کی پابندی کرنالازم ہوتاہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ ایک شخص جو آج بچوں کی خواہش نہیں رکھتا، کل یہ خواہش کرے اور گھر بسانا چاہے۔ بہرصورت، آزادانہ جنسی تعلق خاندان کے ادارے کے لیے خطرہ ہے، اس لیے نہ صرف شادی کے بعد، بلکہ اس سے پہلے بھی یہ ممنوع ہونا چاہیے۔ دین میں یہ اسی بناپر نہ صرف حرام ہے، بلکہ قابل سزا جرم بھی ہے۔

مادہءِ تولید کی سپردگی

جدید بایو ٹیکنالوجی نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ایک مرد اور عورت کے درمیان جسمانی تعلق قائم کیے بغیر کسی مرد کا مادہءِ تولید عورت کے رحم میں رکھ کر یا کسی عورت کا بیضہ کسی دوسری عورت کے رحم میں بارآور کرا کر بچہ پیدا کر لیا جائے۔ ان مرد اور عورت کے درمیان اگر رشتہءِ نکاح نہ ہو تو یہ بچے کو اس کے حقیقی والد یا والدہ یا دونوں سے محروم کرنے کا ایک منصوبہ اور بچے کی حق تلفی ہے۔

اس عمل میں زنا وقوع پذیر نہیں ہوتا، مگر اس سے پیدا ہونے والے نتائج وہی ہیں جو زنا سے پیدا ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے زنا حرام ہے،[38] یعنی ایک بچے کی متوقع پیدایش جس کے حقیقی والدین یا ان میں سے کوئی ایک اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے دستیاب یا تیار نہیں۔

---

[38] تفصیل کے لیے دیکھیے، اسی کتاب میں راقم کا مضمون، 'زنا کی حرمت کی بنیاد "خاندان کا تحفظ'

مادہِ تولید کا عطیہ یا فروخت جسمانی اعضا کے عطیے یا فروخت جیسا معاملہ نہیں۔ نطفہ اور بیضہ انسانی وجود کے تشکیلی عناصر ہیں۔ ان سے پورا انسان وجود پاتا ہے۔ یہ در حقیقت ایک انسان کو عطیہ یا فروخت کرنا ہے اور یہ اخلاقی جرم ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر رشتہءِ نکاح سے باہر مادہءِ تولید کی سپردگی شرعاً حرام اور قانوناً جرم قرار دینی چاہیے۔

سروگیسی

(ادھار کی کوکھ)

شوہر اور بیوی کے مادہءِ تولید سے زائی گوٹ بنا کر ادھار کی کوکھ (سروگیسی) میں رکھ کر بچہ حاصل کرنا، جسے اس کے حقیقی والدین کا نام اور گود ملے، اسے رضاعت پر قیاس کرتے ہوئے درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح رضاعی ماں کے دودھ سے بچے کی پرورش ہوتی ہے، اس معاملے میں یہ پرورش ایک عورت کے خون سے ہوتی ہے۔ رضاعی ماں ہی کی طرح سروگیٹ ماں اور اس کے خونی رشتے، بچے کے لیے رضاعی محرم قرار پاتے ہیں۔ رضاعت کی اجرت کی طرح سروگیسی کی اجرت لینا بھی جائز تصور ہو گا۔

سروگیٹ ماں کا بچے کے ساتھ جذباتی تعلق اسی طرح پیدا ہو جاتا ہے جیسے رضاعت کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ اگر مسئلہ ہے تو باہمی طور پر حل کرنا چاہیے۔ سروگیسی

سے اولاد حاصل کرنا یا سروگیٹ ماں کی خدمات مہیا کرنا افراد کا شخصی معاملہ اور اختیار ہے۔

اسقاط حمل کا اختیار

اسقاط حمل ایک جیتے جاگتے وجود کا قتل ہے، چاہے اس نے انسانی شخصیت اور صورت اختیار کر لی ہو یا ابھی نہ کی ہو۔ اس وجود کی تلفی ایسی ناگزیر مجبوری کی بنیاد ہی پر ہو سکتی ہے، جسے اخلاقی احساس قبول کر سکے۔

قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جنین میں انسانی شخصیت کے ظہور کا مرحلہ اس کی نشو و نما کے دوران میں کچھ وقت کے بعد وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ (المؤمنون، 23: 12-15)

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا تھا۔ پھر اُس کو (آگے کے لیے) ہم نے پانی کی ایک (ٹپکی ہوئی) بوند بنا کر

ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھ دیا۔ پھر پانی کی اُس بوند کو ہم
نے ایک لوتھڑے کی صورت دی اور لوتھڑے کو گوشت
کی ایک بندھی ہوئی بوٹی بنایا اور اُس بوٹی کی ہڈیاں پیدا کیں
اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اُس کو ایک
دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ،
بہترین پیدا کرنے والا۔

"أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ" سے وہ مرحلہ مراد لیا جاتا ہے، جب جنین کا حیوانی وجود انسانی شخصیت حاصل کرتا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ یہ مرحلہ رحمِ مادر میں نطفے کے تقرر سے 120 دن کے بعد آتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ عَلَقَةً ٢مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ (صحیح بخاری، رقم :6133)

یہ حقیقت ہے کہ تم میں سے ہر آدمی کی خِلقت اُس کی ماں
کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی صورت میں جمع رہتی

ہے۔ پھر اتنی ہی مدت میں لہو کی پھٹکی ہو جاتی ہے، پھر اتنی
ہی مدت میں گوشت کی بوٹی بن جاتی ہے۔ اِس کے بعد
فرشتہ بھیجا جاتا ہے اور وہ اُس میں روح پھونکتا ہے۔

120 دن سے پہلے اس حیوانی وجود کا اسقاط انسان کا قتل نہیں تو کہلا سکتا، مگر ایک حیوانی وجود کا خاتمہ بھی بغیر کسی معقول عذر کے نہیں کیا جا سکتا۔ حمل نے اگر انسانی وجود اختیار کر لیا ہو، تو اب اس کی حرمت میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بلا کسی معقول عذر[39] کے اس کا خاتمہ، ایک انسان کا قتل ہے، اور قرآن مجید نے ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے برابر ٹھہرایا ہے۔[40]

اسقاط حمل کا مطلق اختیار حاملہ سمیت کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ حمل کے خاتمے کا انتہائی فیصلہ ضمیر کی روشنی میں کسی ایسے عذر کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے، جسے کل خدا کی عدالت میں پیش کیا جا سکے۔

[39] مثلاً حاملہ کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہو۔

[40] المائدۃ،5:32

بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی

متعلقہ مسائل کا جائزہ اور تجاویز

گزشتہ چند دہائیوں میں جنسی زیادتی سے متعلق واقعات کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں:

آبادی میں اضافہ

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کا پھیلاؤ۔

فحش مواد تک آسان رسائی

آبادی میں اضافے کے ساتھ اس نوعیت کے واقعات میں اضافہ ہونا قابلِ فہم ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور اس سے بڑھ کر سوشل میڈیا پر رپورٹ ہونے والے ایسے واقعات کا چرچا ان کے کثرتِ وقوع کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ تاہم، آبادی کے لحاظ سے ان واقعات کی شرح کم و بیش اتنی ہی معلوم ہوتی ہے جتنی ماضی میں رہی ہے۔

فحاشی کے ابلاغ اور فُحش مواد تک آسان رسائی کے ذرائع کا جنسی زیادتی کا رجحان پیدا کرنے میں کتنا عمل دخل ہے، یہ متحقق نہیں۔ البتہ، یہ معلوم ہے کہ جن ممالک میں فحش مواد کے حصول میں زیادہ پابندیاں حائل نہیں کی جاتیں، بلکہ ہم جنس پرستی کو بھی قانونی جواز حاصل ہے، وہاں بھی ہم جنسی پرستی اقلیت کی دلچسپی تک ہی محدود ہے۔ اکثریت اسے گوارا تو کرتی ہے، مگر بنظر تحسین نہیں دیکھتی۔ بہرحال، جنسی زیادتی کے واقعات کے خلاف سماج کی بڑھتی حساسیت ایک مثبت رجحان ہے، جس سے اس سے متعلق قانونی، سماجی اور ذہنی ڈھانچوں میں بہتری لانے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔

اس مسئلے کے تین فریق ہیں:

بچے

والدین

فاعل: بچے کے ساتھ جنسی عمل کرنے والا، جس کی ایک صورت اس کا جارح (زبردستی کرنے والا) ہونا بھی ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں:

- ❖ ہم جنس پرستی کے واقعات اور رجحان کا سماجی اور مذہبی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔
- ❖ فاعل یا جارح کو زیادتی کے مواقع کیسے ملتے ہیں؟ اس سلسلے میں والدین اور تعلیم گاہوں، خصوصاً، دینی مدارس کے کردار پر بحث کی گئی ہے، جہاں ایسے واقعات تسلسل سے پیش آتے ہیں۔
- ❖ اس جرم کی پیدایش کے عوامل اور منابع کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کی پیش بندی کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔

ہم جنس پرستی کا ثقافتی پہلو

ہم جنسی پرستی دنیا کی تقریباً ہر ثقافت میں موجود رہی ہے۔ برّصغیر پاک و ہند کی ثقافت بھی اس سے خالی نہیں رہی۔ بعض بادشاہ اور امرا اپنے ذوق کی تسکین کے لیے خوب صورت لڑکے اور خواجہ سرا رکھتے تھے۔ یہ رواج بعض اوباشوں کے ہاں اب بھی موجود ہے۔

ہم جنس پرستی کا ایک دوسرا معروف نام "علت المشائخ" ہے، جو خانقاہوں میں اس کے کثرتِ وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ لکھنو اور دہلی کے دبستانوں کی شاعری ہم جنس پرستی کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔

میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا ہم نے کہے

رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا

شاعری میں محبوب کا مذکر ہونا غالباً اسی بنا پر رائج ہوا۔ جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات، "یادوں کی برات" ہم جنس پرستی کے قصوں کو فخر یہ طور پر پیش کرتی ہے۔ ہمارے ہاں تمام مقامی زبانوں میں اس رجحان کی طرف اشارے کرتے محاورے، ضرب الامثال، لطیفے، کنائے اور گالیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سماج میں یہ رجحان نہ صرف قدیم سے موجود ہے، بلکہ گوارا بھی کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ علاقے جو ہم جنسی پرستی میں بری شہرت کے حامل ہیں وہاں بچوں کے ساتھ ان حادثات کا پیش آنا غیر متوقع نہیں سمجھا جاتا ہے۔

شہروں میں پروان چڑھنے والی تہذیب اس لحاظ سے مختلف ہے۔ یہاں گھرانوں میں بچوں کی تعداد کم اور والدین اور اولاد کے درمیان جذباتی وابستگی نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ بچے والدین کی مسلسل نگرانی میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ تہذیب بچوں کے ساتھ ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی کے واقعات گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے لیے ایسے واقعات بجاطور پر بڑا سانحہ ہیں۔

بچوں کی طرف جنسی میلان کی وجوہات

جنسی تسکین کے لیے بچوں کی طرف مائل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جن معاشروں میں عورت کو پردے کے نام پر نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے، عورتوں کے ساتھ معمول کا تعامل بھی ممنوع اور مفقود ہے، مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا شک ہونے ہی پر مقاطعہ سے لے کر غیرت کے نام پر قتل کرنا روایت کا حصہ ہے، وہاں جنسی داعیات آدمی کو ہم جنس پرستی کے کم خطرناک اور نسبتاً آسانی سے دست یاب مصرف کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم جنس پرستی ان علاقوں میں زیادہ پائی جاتی ہے جہاں عورت منظر عام سے غائب ہے۔

دوسری بڑی وجہ ماحول ہے۔ ماحول میں ہم جنس پرستی کے نظائر، تذکرے اور بچپن میں پیش آنے والے جنسی زیادتی کے حادثات ہم جنس پرستی کی طرف مائل کرتے اور اس تسلسل کو جاری رکھتے ہیں۔

لڑکوں کے مدارس کے ماحول میں بھی عورت سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ عورت کو دیکھنے، اس کے بارے میں گفتگو کرنے، حتیٰ کہ اس کو سوچنے پر بھی گناہ گاری کے احساس کو بڑی شدت سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہر عمر کے لڑکوں کے ساتھ تعامل کے ان گنت مواقع میسر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنسی جذبات اپنی تسکین کے لیے ہم جنس پرستی کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ یہاں ہم جنس پرستی کے خلاف حساسیت بھی پائی نہیں جاتی۔ ماحول میں اس کے نظائر بھی موجود ہوتے ہیں، جو مزید حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بہ اندازِ مذمت بھی ہم جنس پرستی کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، چنانچہ جو لوگ اس کی طرف رجحان نہیں رکھتے، وہ بھی اس کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔

ہم جنس پرستی ہمارے سماج میں ہنسی دل لگی کا ایک موضوع ہے۔ مدراس کی نجی مجالس بھی فحش لطیفوں اور ہم جنسی پرستی کے تذکرے سے خالی نہیں ہوتیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے ایک بڑے حصے بشمول مذہبی طبقے نے اس

معاملے میں مذہب کے موقف کو اہمیت نہیں دی، جو اس کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں قومِ لوط کا قصہ بے سمجھ تلاوت تک محدود ہے۔

مدارس میں بچہ والدین کی نگرانی سے دور اجنبی لوگوں کے درمیان رہتا ہے، اس کے لیے استاد کی خوش نودی حاصل کرنے اور ہم مکتب بڑے لڑکوں کی دھمکیوں (Bullying) کے خوف سے تحفظ حاصل کرنے کا یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان کی بات مان لے اور کسی کو شکایت بھی نہ کرے۔ کسی ایک یا چند افراد کا منظورِ نظر بن کر رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ مختلف افراد کی طرف سے عصمت دری کے خطرے سے دوچار رہے۔

ایک بار اس کام کا عادی ہو جانے کے بعد بچہ شکایت کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ بلکہ اس 'خدمت' کو مراعات اور رعایات حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ بڑا ہو کر پھر وہ خود بھی شکاری بنتا ہے۔ یوں ایک شیطانی چکر قائم ہو جاتا ہے۔

جہاں کہیں مقصد براری سہولت سے ممکن نہ ہو وہاں جبر بھی در آتا ہے۔ معاملہ انتہائی صورت میں قتل تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

اس معاملے کی درست تفہیم کے لیے چند اصولی باتیں طے کرلینا ضروری ہیں۔

پہلی یہ کہ طاقت ور ہمیشہ کم زور کے استحصال کی طرف مائل رہتا ہے۔ استحصال کی روک تھام قانون اور اخلاق کے موثر نظام کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں قانون غیر موجود یا غیر موثر ہوتا ہے، یا کم زور کی حمایت کے لیے اخلاقی دباؤ میسر نہیں آتا، وہاں طاقت ور، کم زور کا استحصال کرتا یا کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ضمیر کے سوا کوئی چیز اسے روک نہیں سکتی، مگر اس درجے کی اخلاقی تربیت ہر موقع پر دستیاب نہیں ہوتی۔

دوسری یہ کہ اپنے فطری اور حقیقی نگہ بانوں، یعنی والدین اور قریبی سرپرستوں کی عدم نگرانی میں کم سن بچے، کسی قریبی رشتے دار یا محلے دار کو دستیاب ہو جائیں یا

بڑی عمر کے ہم سبق، ہم مکتب لڑکوں یا استاد کو، بچوں کے استحصال کرنے کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ بچوں کی دستیابی کے اوقات جتنے زیادہ ہوں گے، ان کے استحصال کے مواقع بھی اتنے زیادہ ہوں گے۔

کم سن بچے اسکولوں میں بھی کافی وقت کے لیے موجود ہوتے ہیں، مگر وہاں اس طرح کے واقعات کا پیش آنا بہت کم ہے، خصوصاً پرائیویٹ اسکولوں میں۔

اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

1. اسکولوں میں کاروباری نفسیات کار فرما ہوتی ہے۔ تدریس کا معاوضہ لیا جاتا ہے۔ بچے یہاں گاہک ہوتے ہیں، جنھیں خوش اور راضی رکھنا اسکول انتظامیہ کی ترجیح ہوتی ہے۔ جنسی زیادتی تو درکنار اتفاقاً بھی کوئی حادثہ پیش آجائے تو اسکول کی ساکھ داؤ پر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسکولوں میں بچوں سے جنسی زیادتی کے امکانات بھی پیدا نہیں ہونے دیے

جاتے اور ایسا کوئی واقعہ پیش آ جائے تو اس پر سخت کارروائی کی جاتی ہے۔

2. اسکولوں میں اساتذہ کے احتساب کا نظام بہت کڑا ہوتا ہے، کیونکہ اسکول اپنی شہرت کو کسی قیمت پر خراب ہونے نہیں دینا چاہتا، جس پر اس کے کاروبار کا انحصار ہوتا ہے۔
3. اساتذہ عموماً اپنے روزگار سے محروم ہو جانے کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے ان میں سے کسی میں اگر ہم جنسی پرستی یا جنسی زیادتی کا رجحان موجود بھی ہو تو وہ اس پر عمل کرنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔
4. کم سن بچوں کو پڑھانے کے لیے عموماً خواتین اساتذہ رکھی جاتی ہیں۔
5. مختلف عمر کے بچوں کے کمرا ہائے جماعت الگ الگ ہوتے ہیں۔
6. کم سن بچوں کے اسکول رہائشی نہیں ہوتے۔
7. اسکولوں میں تنہائی کے مواقع کم یاب ہوتے ہیں۔

8. معیاری اسکولوں میں نگران کیمرے نصب ہوتے ہیں۔

9. سرکاری اسکولوں میں اگرچہ کاروباری نفسیات کارفرما نہیں ہوتی اور ملازمت کا تحفظ بھی بڑی حد تک میسر ہوتا ہے، مگر اس قسم کے واقعات معلوم ہو جانے سے استاد کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ (اے سی آر) خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ملازمت سے برخاستگی، معطلی یا ترقی میں رکاوٹ کے خدشات اور بدنامی کا ڈر رہتا ہے۔ یہ عوامل اس قسم رجحانات کو قابو میں رکھنے کے لیے کافی موثر ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر اسکولوں میں جنسی زیادتی کے واقعات کم ہوتے ہیں۔ البتہ رضامندی سے مطلب براری کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس، مدارس میں ہم جنسی پرستی اور جنسی زیادتی کے زیادہ مواقع دستیاب ہونے کے پیچھے درج ذیل عوامل کارفرما ہیں:

1. مدارس کاروباری نفسیات سے آزاد ہوتے ہیں۔ عطیات اور چندے کے پیسوں سے مدارس کے اخراجات چلائے جاتے ہیں۔ تعلیم مفت ہے۔ مفت میں دی ہوئی چیز احسان مندی کا تقاضا کرتی ہے اور احسان مند کا استحصال کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یہاں بچے کو خوش اور راضی رکھنا انتظامیہ کی مجبوری یا ترجیح نہیں ہوتی۔
2. کم سن بچوں کو بھی رہایشی مدارس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ اپنی حفاظت کی صلاحیت سے محروم بچے فاعلین اور جارحین کے لیے آسان شکار ہوتے ہیں۔
3. مدارس میں بچے اپنے فطری اور حقیقی نگہ بانوں (والدین / سرپرست) کی عدم نگرانی میں طویل اوقات کے لیے مدارس میں دست یاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً، رہایشی مدارس میں رات کے اوقات میں بچے بھی موجود ہوتے ہیں۔

4. کم سن بچوں کے اساتذہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔ مدرسے کے اندر اساتذہ کے حجرے اور ہاسٹلز ہوتے ہیں، جن میں بغیر اجازت داخلہ منع ہوتا ہے۔

5. قرآن مجید اور دین کا استاد ہونے کی بنا پر مدارس کے اساتذہ کے ساتھ جڑے خصوصی ادب واحترام کارواج استاد کو زیادہ بااختیار اور بے خوف بناتا ہے۔ استاد کی شکایت کرنا آسان نہیں اور پکے ثبوت کے بغیر الٹا شکایت کنندہ ہی بے ادب اور گستاخ قرار پاتا ہے۔

6. جس طالبِ علم یا استاد کے تعلقات زیادہ مضبوط ہوں اس کے خلاف بولنا یا کارروائی کرنا عموماً احاطہءِ امکان سے باہر ہوتا ہے۔ فاعل اگر مہتمم (پرنسپل) ہو تو اسے گویا مستقل مامونیت حاصل ہوتی ہے۔

7. استاد کا بچے پر تشدد کرنے کا اختیار ایک تہذیبی قدر کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ استاد کے اختیارات کی یہ وسعت بچے پر جسمانی تشدد کے علاوہ اس کے جنسی استحصال کے لیے بھی سہولت پیدا کرتی ہے۔

8. مدارس میں اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا اور نہ ان کے وسائل اجازت دیتے ہیں کہ مختلف عمر کے بچوں کو الگ الگ جماعتوں میں بانٹ کر پڑھایا جائے۔ یہاں چھوٹے بڑے سب بچے ایک چھت کے نیچے بیٹھتے ہیں۔یوں بڑے لڑکوں کی چھوٹے بچوں تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔

9. مدارس میں نگران کیمروں کی تنصیب کا رجحان نہیں ہے۔بلکہ اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

10. اہلِ مدارس میں فاعل کی جنسی بے راہ روی کی تشہیر نہ کرنے کو عیوب کی پردہ پوشی کے دینی تصور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ دین کی یہ نصیحت ان عیوب سے متعلق ہے جن کا اثر فرد کی اپنی ذات تک محدود

رہتا ہے۔ آدمی کی وہ برائی جو دوسروں کو متاثر کرے، اس کے خلاف تو گواہی دینے کا حکم ہے اور اس گواہی کو چھپانا جرم قرار دیا گیا ہے۔

11. مدارس میں ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی کے بارے میں فاعل کے خلاف ضابطے کی کارروائی سے متعلق عمومی رویہ ہے کہ جب تک ٹھوس ثبوت ہاتھ نہ آجائے یا معاملہ مدرسے کی بدنامی کو نہ پہنچ جائے، مدارس کی انتظامیہ صرفِ نظر سے کام لیتی ہے۔ کسی فاعل کے خلاف کارروائی ہو بھی تو خود احتسابی کے اندرونی نظام کے تحت ہوتی ہے۔ پولیس اور سماج کو شامل نہیں کیا جاتا تاکہ مدرسے کی بدنامی نہ ہو۔ اس طرح فاعل کی سماجی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسے مدرسے یا مسجد سے نکال بھی دیا جائے تو کسی دوسرے مدرسے یا مسجد میں باآسانی شمولیت اختیار کرلیتا ہے۔

یہاں قرآن مجید کی وہ حکمت سمجھ آتی ہے کہ زانی کی سزا کے وقت لوگوں کی ایک تعداد موجود رہنی چاہیے تاکہ لوگ اسے پہچان بھی لیں اور اس کے شر سے بچ سکیں۔

12. مدارس میں کردار کی سند (کیریکٹر سرٹیفیکیٹ) جاری کرنے کا کوئی قانون اور رواج نہیں۔ ایک فاعل کو ایک مدرسے سے نکال بھی دیا جائے تو دوسرے مدارس میں داخلے یا مسجد میں امامت وغیرہ کی ملازمت کے حصول میں اسے دقت پیش نہیں آتی۔ یوں دین کے لبادے میں اسے اپنے رجحان کی تسکین کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

13. مدارس میں طلبا کو جن باتوں اور اقدار کے لیے حساس بنایا جاتا ہے ان میں ہم جنس پرستی کے خلاف حساسیت پیدا کرنا شامل نہیں ہے۔ یہاں زور "حساس" بنانے پر ہے۔ کسی مسئلے کی محض آگاہی یا مذمت ایک بات ہے اور اس کے بارے میں حساس بنانا دوسری بات۔ اہل مدارس

جس طرح توہینِ مذہب، ناموسِ رسالت، ناموسِ صحابہ، اور مسلکی علامات و مسائل کے بارے میں شدید حساس ہوتے ہیں، ہم جنس پرستی اور بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے خلاف اس طرح حساس نہیں ہوتے، بلکہ ان جرائم کے مرتکبین کے لیے ان کے ہاں مدافعانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ دوسرے فرقے کے افراد کے خلاف بھی ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی کے الزامات تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس بارے میں ایک خاموش اتحاد ہے جو مختلف مسالک اور فرقوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کوئی فاعل یا جارح پکڑا جائے تو یہ اسے سزا سے بچانے کے لیے متحرک ہو جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اور معاشرے میں اس کی حیثیت عرفی بحال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

14. مدارس میں طلبا کی نگرانی کا انتظام بھی کیا جاتا ہے، مگر اتنے امکانات پیدا کرنے کے بعد چور راستوں کو مکمل طور پر بند کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

مدارس کے وفاقوں کا کردار

مدارس میں ہم جنسی پرستی اور جنسی زیادتی کے مسلسل واقعات پر مدارس کے وفاقوں کی مستقل خاموشی اس بارے میں ان کی عدم حساسیت کی مظہر ہے۔ وہ مسئلے کی سنگینی کو تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں، چہ جائیکہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

اس کے برعکس، مسلکی حساسیت کا یہ عالم ہے کہ ادنیٰ فکری اختلاف پر فوری اور شدید ردعمل دیا جاتا ہے۔ تنبیہ، فتوی، مقاطعے اور خارج عن المسلک قرار دینے تک کے اقدامات کرنے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ مگر کسی مدرسے میں جنسی زیادتی

کے کسی انتہائی واقعے میں بھی ان کی طرف سے کبھی کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں آتا۔

ہم جنس پرستی کے لیے ان کی یہ خاموش حمایت، فاعلین اور جارحین کے لیے بڑی حوصلہ افزا ہے۔

کم سن بچوں کے مدارس میں داخلے کی وجوہات

کم سن بچوں کا مدارس میں داخلہ والدین کی رضامندی بلکہ ان کی خواہش اور اصرار پر ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ والدین کی اس خواہش اور اصرار کی وجوہات تلاش کی جائیں جو انھیں اپنے کم سن بچوں کی عزت و آبرو بلکہ ان کی جان کو بھی داؤ پر لگا کر انھیں غیروں کے حوالے کر دینے پر راضی کر لیتی ہیں۔ مدارس میں جنسی زیادتی کے واقعات کے مسلسل رپورٹ ہونے کے باوجود بھی کم سن بچوں کے داخلے میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آتی اور نہ پہلے سے موجود بچوں کو وہاں سے نکال لے جانے کا کوئی رجحان دکھائی دیتا ہے۔

کم عمر بچوں کو مدارس میں داخل کرانے کے رجحان کے پیچھے دو طرح کے عوامل کارفرماہیں:

مذہبی عوامل

سماجی عوامل

مذہبی عوامل

کم سن بچوں کو مدارس میں داخل کرانے کے لیے مذہبی علما اور خطبا کی جانب سے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ بچوں کو دین کا عالم اور قرآن کا حافظ بنائیں کیونکہ علم حاص کرنے، خصوصاً،حفظِ قرآن کے لیے بہترین عمر بچپن کی ہے۔اس سلسے میں ضعیف روایات سنائی جاتی ہیں کہ ایک حافظِ قرآن اپنے خاندان کے دس ایسے افراد کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی

ہو گی، ۔[41] حافظِ قرآن کے والدین کو روزِ قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی روشنی سے بھی زیادہ ہو گی۔[42] یہ ترغیبات والدین کو ابھارتی ہیں کہ وہ ہر خطرہ مول لے کر بچوں کو حفظ کرانے مدارس میں داخل کرا دیں۔

---

[41] لِحَامِلُ الْقُرْآنِ إِذَا أَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَنْ يَشْفَعَ فِي عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ(المعجم الأوسط، 5258)

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

علامہ البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعيف الجامع الصغير وزيادته، رقم: 4662)

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

مَن قرأَ القرآنَ واستَظهرَهُ فأحلَّ حلالَهُ وحرَّمَ حَرامَهُ أدخلَهُ اللَّهُ بِهِ الجنَّةَ وشفَّعَهُ في عَشرةٍ من أهلِ بَيتِهِ كلُّهُم قَد وجبَت لَهُ النَّارُ (الترمذی:2905)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام سمجھا وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانیؒ نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعيف الترمذي، رقم: 2905)

سند کے ضعف سے قطع نظر، یہاں حامل قرآن کے الفاظ آئے ہیں جو قرآن کے حلال و حرام کو سمجھتا ہے۔ اس سے وہ حافظ قرآن مراد نہیں ہو سکتا جسے قرآن کے معانی سے کوئی سروکار نہیں۔

جو بچے ان علاقوں سے آتے ہیں جہاں ہم جنس پرستی پہلے ہی ماحول میں موجود ہوتی ہے، جنسی زیادتی کا حادثہ بچے کے ساتھ وہاں بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس لیے ان علاقوں کے والدین اس معاملے میں بہت حساس نہیں پائے جاتے۔

راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی۔ انھیں خبر کی گئی، وہ آئے، بچے کو تسلی دی اور اسی مدرسے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظِ قرآن

[42] أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا؟ (ضعيف الجامع الصغير وزيادته، ص831)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہو گی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمہارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہو گا"۔

علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ تاہم، اس روایت میں بھی بلا فہم حفظ کی کوئی فضیلت بیان نہیں ہوئی۔

مکمل کرائے بغیر وہ اسے واپس لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے لیے ایسے حادثات غیر متوقع نہیں تھے۔ ان خدشات کو گوارا کرتے ہوئے ہی وہ اپنے کم سن بچوں کو اجنبی ماحول کے سپرد کر آتے ہیں۔

سماجی عوامل

مدارس میں بچوں کے داخلے کے رجحان کے سماجی عوامل درج ذیل ہیں:

غربت

کم آمدن اور مفلس گھرانوں کے بچوں کی ایک بڑی تعداد مدارس میں داخل کرائی جاتی ہے۔ مدارس میں طلبا کو رہایش، کھانا اور کپڑے وغیرہ مفت مہیا کیے جاتے ہیں۔

دوسرا فائدہ مفت دینی تعلیم کے حصول کا ہے۔ امکان ہوتا ہے کہ مفت پرورش کے ساتھ بچہ اگر حافظ، قاری یا عالم بھی بن جائے تو نہ صرف یہ کہ سماج میں عزت ملے گی بلکہ روزگار کا وسیلہ بھی ہاتھ آ سکتا ہے۔ کسی مدرسے یا مسجد میں اسے بطور

خادم، مؤذن یا امام ملازمت مل سکتی ہے یا حفظ و ناظرہ قرآن پڑھانے یا مدرسی کتب کی تدریس کی نوکری حاصل ہو سکتی ہے یا وہ اپنا مدرسہ یا مسجد بھی بنا سکتا ہے۔

بچہ اگر کچھ نہ بھی بن پائے تب بھی اسے اُس وقت تک مدرسے میں رکھا جاتا ہے جب تک وہ کمائی کی عمر کو پہنچ کر والدین کا سہارا بننے کے قابل نہ ہو جائے۔ جب وہ اس قابل ہو جاتا ہے تو اسے مدرسے سے ہٹا کر کسی کام پر لگا دیا جاتا ہے۔

کثیر العیالی

کثیر العیالی نہ صرف مذہبی طور پر مستحسن سمجھی جاتی ہے بلکہ سماجی لحاظ سے زیادہ افراد پر مشتمل گھرانہ، اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری بھی سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً دیہی اور قبائلی علاقوں میں جہاں قانون کا تحفظ کم زور لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا، اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کثیر العیال والدین دینی اور سماجی دونوں لحاظ سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اپنے ایک یا ایک سے زائد بچوں کو مدرسے میں داخل کروا کر سماجی عزت اور آخرت میں ثواب حاصل کریں۔ زیادہ بچوں پر

مشتمل گھرانہ اگر کم وسائل کا حامل ہو تو مدرسہ میں داخلہ ان کی ترجیح ہی نہیں مجبوری بھی بن جاتی ہے۔

کثیر العیال والدین کی اپنے بچوں سے عموماً اتنی گہری، جذباتی وابستگی نہیں ہوتی جو شہری ماحول میں کم بچوں والے گھرانوں کے والدین میں دیکھی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بھی وہ اپنے بچوں کے جذبات، ان کی شکایات اور ان کی کم سنی میں پیش آنے والے خطرات کے بارے میں عموماً زیادہ حساس نہیں ہوتے۔ مدارس میں داخل اپنے بچوں کی کئی کئی ماہ خبر نہیں لیتے۔ بعض بچے سال بھر میں عیدین کے موقع ہی پر گھر والوں کا منہ دیکھ پاتے ہیں۔ والدین اور بچوں کے درمیان گفتگو کا خلا اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بچے کا اپنے ساتھ بیتی کسی زیادتی کا ان سے ذکر کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ایسے تقریباً لاوارث قسم کے بچے ہم جنس پرستی کے عادی فاعلین اور جارحین کے لیے ترنوالہ ہوتے ہیں۔

سماجی عزت کا حصول

گھرانے میں حافظ بچے کی موجودگی خاندان اور سماج میں عزت و شرف دلاتی ہے۔ اس بنا پر غربا ہی نہیں، امراء کے ہاں بھی بچوں کو قرآن حفظ کرانے کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔

تجاویز

1. بچوں کو جنسی حملوں اور جنسی ترغیبات سے بچانے میں سب سے اہم کردار والدین کا ہے۔ بچے کی پرورش، تعلیم اور تربیت ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ معتبر اور موثر نگرانی کے بغیر کم سن بچوں کو اندیشے کی جگہوں پر نہ بھیجا جائے۔
2. بچے پیدا کرنا دین کا حکم نہیں۔ یہ والدین کا اپنا فیصلہ ہے۔ ان پر لازم ہے کہ اپنے وسائل کے مطابق اولاد پیدا کریں۔

3. قانون کی بالادستی یقینی بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ ذاتی تحفظ کی خاطر بڑے خاندان بنانے کی ضرورت نہ رہے۔

4. جنسی زیادتی سے متعلق معاملات کی رپورٹ کرنے کے لیے بچوں اور عوام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بچوں کی تربیت کی جائے کہ اپنے یا کسی دوسرے کے ساتھ ایسے کسی حادثے یا اس کے ابتدائی مقدمات جیسے کسی کا انھیں بے ہودہ طریقے سے چھونا (بیڈ ٹچ) وغیرہ، کی اطلاع بلا جھجھک اپنے والدین اور قابل بھروسہ بڑوں کو دیں۔ انھیں سمجھایا جائے کہ ایسی حرکت فاعل کے لیے بدنامی اور شرمندگی کا باعث ہونی چاہیے نہ کہ متاثرہ فرد کے لیے، جو کہ مظلوم ہے۔

5. کم سن بچوں کو جسم چھونے کے اچھے اور برے انداز (Good and bad touch) میں پیار اور بے ہودگی کے فرق کو سمجھنے کی تعلیم دی

جائے۔ اس سلسلے میں والدین کی تربیت کے لیے ورک شاپس کروائی جائیں، تاکہ وہ اپنے بچوں کو ایسے معاملات کی آگاہی دے سکیں۔

حکومت کو درج ذیل امور میں قانون سازی کرنے اور اس پر عمل درآمد کے لیے حقیقی عزم کی ضرورت ہے:

1. کم از کم بارہ سال کی بنیادی تعلیم، تعلیمی رجحان رکھنے والے ہر بچے کا بنیادی حق قرار دی جائے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا بھی اس کا حق ہے کہ اس نے حافظ، قاری، عالم بننا ہے یا ڈاکٹر، انجینئر، اکاؤنٹنٹ وغیرہ۔ چنانچہ مدارس میں کم سن بچوں کے رہائشی داخلے پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے۔ مدارس دینی تعلیم کے تخصیصی ادارے ہیں۔ تخصیصی تعلیم کے لیے کم سن بچوں کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔
2. اسکولوں کی طرز پر وزارت تعلیم کے تحت تمام مدارس کی رجسٹریشن کو یقینی بنایا جائے۔ مدارس کے تعلیمی وفاقوں کو قومی تعلیمی بورڈ میں ضم

کیا جائے۔ رجسٹریشن کی شرائط میں عمارت اور دیگر لوازمات کا تعلیمی نقطہ ءِ نظر سے قابل قبول ہونا لازمی شرائط میں ہونا چاہیے۔ ان شرائط پر پورا نہ اترنے والے مدارس کی رجسٹریشن منسوخ کر دی جائے۔ اس منسوخی کی موثر تشہیر کی جائے تاکہ لوگ اپنے بچے وہاں داخل نہ کرائیں۔ جو مدارس بلا سندِ اجازت مدرسہ چلائیں، ان کی تالہ بندی کی جائے اور قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔

3. مدارس کی انتظامی کمیٹیوں اور ان کے تعلیمی بورڈز کے اراکین میں حکومت اور سماج کے معتبر افراد کی متعد بہ تعداد کا شامل ہونا لازم قرار دیا جائے، تاکہ سماج کی طرف سے نمائندہ نگرانی مدارس کے انتظام میں موجود رہے۔

4. مدارس سے ملنے والی جنسی زیادتی کی شکایت پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے موثر تفتیش کی جائے اور جرم ثابت ہونے پر

متعلقہ افراد کو سزا کے علاوہ انتظامیہ کی کوتاہی ثابت ہونے پر مدارس پر جرمانہ اور / یا ان کی رجسٹریشن کی منسوخی وغیرہ پر عمل درآمد یقینی بنایا جائے۔

5. مدارس میں داخلے اور مساجد میں تقرری کے لیے امیدوار کے کردار کی سند (کیریکٹر سرٹیفکیٹ) کو لازمی قرار دیا جائے۔ کسی بدکرداری اور بد اخلاقی کی صورت میں کردار کی سند جاری کرنے والے ادارے کو ذمہ داری میں شامل کیا جائے۔

6. ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی سے متعلق قرآن مجید کی متعلقہ آیات کو ثانوی اور میٹرک کے نصابات میں شامل کیا جائے۔

نکاح کی عمر کی تحدید کا مسئلہ

نکاح کے لیے فرد کی جسمانی اور ذہنی اہلیت اور اس کی رضامندی نکاح کی دو معقول بنیادی شرائط ہیں جن کا لحاظ ہر مہذب معاشرے سے متوقع ہے۔ ان کی خلاف ورزی فرد کی حق تلفی اور اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ تاہم، فقہا کے مطابق، نابالغ کے ولی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کی مصلحت دیکھے تو اس کا نکاح کر دے۔ ولی اگر نامحرم ہے تو اپنی زیرِ کفالت نابالغ بچی سے خود بھی نکاح کر سکتا ہے۔ ولی اگر باپ یا دادا ہوں تو فقہا بالاتفاق نابالغ کے نکاح کر دینے کے معاملے میں ان کا اختیار تسلیم کرتے ہیں۔

فقہا کے مطابق نابالغ کو بلوغت کے بعد اس کے بچپن میں طے کیے گئے نکاح کو رد کرنے کا اختیار ہے، لیکن باپ یا دادا کی طرف سے ان کے طے کردہ نکاح سے انکار کا حق انھیں نہیں ہے، سوائے یہ کہ ان کا سوئے اختیار ثابت ہو جائے۔

روایتی نقطہ نظر میں بھی بالغ فرد کے نکاح کے لیے اس کی رضامندی ضروری سمجھی گئی ہے، تاہم، نابالغ کے نکاح میں اس کی رضامندی کو اہم نہیں سمجھا گیا کیوں کہ نابالغ اپنا اختیار نہیں رکھتا۔

سوال یہ ہے کہ بالغ کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا تو نابالغ، جو نکاح کا اہل ہی نہیں، اس کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟ نابالغ اگر نکاح کے لیے راضی بھی ہو تو اس کی رضا معتبر ہی نہیں، تو اس پر عمل کیسے کیا جا سکتا ہے؟

نابالغ کے نکاح پر اولیا کے اختیار کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔ کسی سماج اور کسی دور کی تہذیبی اقدار کو دین و شریعت کے تقاضے نہیں بنایا جا سکتا۔ نابالغ کا ولی اس کے حق میں وہی تصرف کر سکتا ہے جو اس کی مصلحت میں ہو نہ کہ اس کے خلاف۔ نابالغ نکاح کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کا نکاح اس کی مصلحت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کا ولی اس کے نکاح کا اختیار نہیں رکھتا۔

عرب سمیت دیگر ثقافتوں میں بچپن کے نکاح کا رواج رہا ہے اور اب بھی بعض جگہ موجود ہے۔ تاہم، یہ بچوں کے سرپرستوں کی خواہش کے اظہار سے زیادہ کچھ نہیں، جس کو پورا کرنا یا نہ کرنا بچوں کا اختیار ہے جب وہ جوان ہو جائیں۔

تاہم، قرآن مجید اس الزام سے بری ہے کہ اس نے کسی بھی درجے میں نابالغ بچیوں کے نکاح کی اجازت دی ہے، چہ جائے کہ ان کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کرنے کی اجازت بھی دی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کی رسول اکرم ﷺ سے کم سنی میں نکاح کی نظیر بھی کم سنی کے نکاح کے جواز کی تائید میں پیش کی جاتی ہے کہ اگر یہ عمل معیوب ہوتا تو رسول اکرم ﷺ ایسا کیوں کرتے۔ مگر یہ روایت بھی متعدد اشکالات سے خالی نہیں۔

ہماری علمی روایت میں قاضی ابن شبرمہ اور ابو بکر الاصم نے نابالغ کے نکاح کے موقف سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے مطابق، نکاح کے لیے بلوغت ضروری ہے، جس کی تائید قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰي حَتّٰٓي اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ. (النساء ۴: ٦)

”اور نکاح کی عمر کو پہنچنے تک اِن یتیموں کو جانچتے رہو۔“

ان کے مطابق، ولی کی ولایت نابالغ بچوں کے لیے ان امور میں متحقق ہے جہاں انھیں کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو، جیسے لین دین کے معاملات۔ نابالغ کو چونکہ نکاح کی کوئی

حقیقی حاجت نہیں، اس لیے یہاں ولایت کی ضرورت نہیں۔ نکاح سے جنسی تسکین اور اولاد کی تحصیل مقصود ہوتی ہے اور نابالغ کے معاملے میں یہ دونوں مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ کہ اس عقد نکاح کے احکام کا اطلاق بلوغ کی عمر کے بعد ہوتا ہے جب ولی کی ولایت باقی نہیں رہتی اس لیے بالغ پر اس عقد کی پابندی واجب نہیں ہوتی۔[43]

جہاں تک نو بالغ کے نکاح کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہیں کہ نو بالغ کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما بھی مکمل نہیں ہوتی۔ بچے کے حمل و پیدایش کے نازک مراحل کے لیے لڑکی اور نان نفقے کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے لڑکا ابھی پوری طرح پر تیار نہیں ہوتے۔ کچی عمر میں ان کا نکاح ان کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہے اور اس بنا پر حکومت کو یہ حق ہے کہ اگر بچوں کے سرپرست ان کے نکاح کے معاملے میں تجاوز برتیں تو اسے روکے۔ اس سلسلے میں حکومت ماہرینِ قانون اور ماہرینِ طب کے مشورے سے نکاح کی عمر میں تحدید کے لیے قانون سازی بھی کر سکتی ہے۔

[43] سرخسی، المبسوط، دار المعرفۃ-بیروت، لبنان، 1431ھ، ۴/ ۲۱۲۔

روایتی موقف کے مطابق بھی نابالغ کے نکاح کا یہ معاملہ جواز ہی کا ہے۔ یعنی شریعت میں اس بارے میں کوئی مثبت حکم موجود نہیں کہ نابالغ بچوں کے نکاح کیے جائیں۔ جواز کے معاملات میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔

روایتی موقف پر نقد، ہمارا موقف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کی کم سنی میں نکاح کی روایات پر اشکالات ذیل میں پیش کیا جاتے ہیں۔

روایتی موقف

قرآن مجید کے تین مقامات سے نابالغ بچیوں کے نکاح کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔

ان میں دو سورہ نساء میں ہیں اور ایک سورہ طلاق میں ہے۔

سورہ نساء کی پہلی آیت یہ ہے:

{وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى أَلَّا تَعُولُوا} [النساء: 3]

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

اور اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے تو (ان سے نکاح کرنے کے بجائے) دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کر لو جو تمھیں پسند آئیں، دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے۔ ہاں! اگر تمھیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمھاری ملکیت میں ہیں۔ اس طریقے میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی میں مبتلا نہیں ہو گے۔ (آسان ترجمہ ٔ قرآن از مولانا تقی عثمانی)

دوسری آیت اس کی توضیح میں پیش کی جاتی ہے:

{وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَى بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا } [النساء: 127]

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اور اس کتاب (یعنی قرآن) کی آیتیں جو تم کو پڑھ کو سنائی جاتی ہیں وہ بھی ان یتیم عورتوں کے بارے میں (شرعی حکم بتاتی ہیں) جن کو

تم ان کا مقرر شدہ حق نہیں دیتے، اور ان سے نکاح کرنا بھی چاہتے ہو، نیز کمزور بچوں کے بارے میں بھی (حکم بتاتی ہیں) اور یہ تاکید کرتی ہیں کہ تم یتیموں کی خاطر انصاف قائم کرو۔ اور تم جو بھلائی کا کام کرو گے، اللہ کو اس کا پورا علم ہے۔ (آسان ترجمہءِ قرآن، از مولانا تقی عثمانی)

استدلال یہ ہے کہ بن باپ کے نابالغ بچے کو یتیم کہا جاتا ہے۔ آیت 3 میں یتیموں کے جن حقوق کی تلفی کا اندیشہ ذکر ہوا تھا اس کی وضاحت آیت 127 میں کر دی گئی ہے کہ یہ 'یتامی النساء' یعنی یتیم عورتیں ہیں اور عورتوں سے مراد نابالغ بچیاں ہیں، جن سے نکاح کی صورت میں ان کا حق مہر دینے میں لوگ بے انصافی سے کام لے رہے تھے۔ وہ یوں کہ یتیم بچی اگر خوب صورت اور مال دار ہوتی تو اس کا ولی اس سے خود نکاح کر لینا چاہتا تاکہ اس کا مال بھی اپنے پاس رکھ سکے، جس کا وہ نگران تھا، مگر وہ حق مہر ادا کرنے میں انصاف

نہ کرتا۔ اس حق تلفی سے روکنے کے لیے ترغیب دی گئی کہ ان یتیم بچیوں سے نکاح کی بجائے اپنی پسند کی دیگر خواتین سے نکاح کر لو۔[44]

تفسیر قرطبی میں ہے:

فَنُھُوا أَنْ یَنْکِحُوھُنَّ إِلَّا أَنْ یُقْسِطُوا لَھُنَّ[45]

انھیں ان یتیم بچیوں سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا مگر یہ کہ ان سے انصاف کریں (تو نکاح کر سکتے ہیں۔)

یتیم بچی سے ولی کے نکاح کر لینے کی اجازت سے یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ اس کا نکاح کہیں اور بھی کر سکتا ہے۔

مفتی شفیع اپنی تفسیر 'معارف القرآن' میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں یتامی سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، اور اصطلاحِ شریعت میں یتیم اسی لڑکی یا لڑکے کو کہا جاتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو، اس لیے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یتیم

[44] تفسیر ابن کثیر، 2/209

[45] «تفسیر القرطبي = الجامع لأحکام القرآن» (5/11)

لڑکی کے ولی کو یہ بھی اختیار ہے کہ بحالتِ صغر سنی بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کر دے، البتہ لڑکی کی مصلحت اور آئندہ فلاح و بہبود پیش نظر رہے۔"[46]

روایتی موقف پر نقد

روایتی موقف کی اس تفہیم پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

'یتامی' کا لفظ لڑکا اور لڑکی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یتامی" کا لفظ ان نابالغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا باپ فوت ہو چکا ہو، عام اس سے کہ وہ نابالغ، لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ صرف نابالغ لڑکیوں کے لیے اس کا استعمال نہ عربی زبان میں معلوم ہے، نہ قرآن مجید اور حدیث میں۔ قرآن میں یہ لفظ کم از کم پندرہ

[46] معارف القرآن، ج2، ص286

جگہ اسی جمع کی صورت میں استعمال ہو ہے لیکن کسی جگہ بھی صرف یتیم بچیوں کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوا۔"[47]

سورہ نسا کی آیت 1 سے 10 تک ایک ہی سلسلہ کلام ہے جو یتیموں کے مالی حقوق تلف کرنے سے منع کرتا ہے اور کسی جگہ 'یتامی' کے لفظ کو یتیم بچیوں کے لیے مختص نہیں کرتا۔ آیت 3 میں بھی یتیموں سے بے انصافی سے مراد ان کے مالی معاملات میں بے انصافی ہے۔ یہ بات آیت کے سیاق وسباق سے عیاں ہے۔ چنانچہ آیات کی درست تفہیم یہ ہے کہ یتیموں کے مال میں خیانت اور کوتاہی پر جب سخت تنبیہ کی گئی تو لوگ معلوم ہوتا ہے، ڈر گئے اور یتیموں کے مالی معاملات کی ذمہ داری لینے میں ہچکچانے لگے۔ اس پر انھیں ہدایت دی گئی کہ ان کے مالی معاملات کی نگہ داشت میں انھیں اپنی طرف سے بے انصافی کا اندیشہ لاحق ہے تو 'ان عورتوں' (النساء) سے نکاح کر کے مسئلہ حل کر لیں۔

---

[47] تدبر قرآن۔۔۔۔

یہ عورتیں کون ہیں؟

النساء میں 'ال' عہد کا ہے۔ یعنی مخاطب کے نزدیک وہ عورتیں پہلے سے معلوم ہیں۔ یہ ان یتیموں کی رشتہ دار عورتیں یعنی ان کی مائیں اور بہنیں ہی ہو سکتی ہیں، جن کو یتیموں کا ولی اپنے نکاح میں لے آئے تو یتیم کے مال کی نگہ داشت میں گویا یتیم کا وکیل شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یتیموں کے حق میں بے انصافی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آیت کے اس فہم کو آیت 127 میں لفظاًواضح بھی کر دیا گیا ہے کہ یہ 'یتامی النساء'، یعنی یتیموں کی عورتیں ہیں۔ 'یتامی النساء' مرکب اضافی ہے۔ جس کا مطلب یتیموں کی عورتیں ہے، نہ کہ یتیم عورتیں۔

دوسرے یہ کہ 'النساء' کا معنی نابالغ بچیاں نہیں ہو سکتا۔[48] 'النساء' کے متبادر معنی یعنی، عورتوں، سے اسے پھیر کر بچیاں مراد لینے کے لیے قرینہ درکار ہے جو یہاں موجود

[48] مولانا تقی عثمانی کے ترجمہ قرآن، 'آسان ترجمہءِ قرآن' کے حواشی سے بھی یہی متبادر ہے کہ وہ یہاں یتیم بچیوں سے ان کے بالغ ہونے پر ان کے نکاح کا مفہوم مراد لیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے منقول روایت میں انھوں نے یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

نہیں۔ یہ قرینہ ایک اور آیت میں جب مہیا ہوا ہے تو وہاں 'النساء' کا مفہوم بچیاں لیا گیا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل آیت دیکھیے:

{وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ} [البقرة، 2: 49]

اور یاد کرو، جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑایا۔ وہ تمھیں برے عذاب چکھاتے تھے، تمھارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر دیتے تھے اور تمھاری عورتیں جیتی رہنے دیتے تھے اور (تمھیں) اِس (عذاب سے چھڑانے) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔

" صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ نے اس ہدایت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ بعض اوقات ایک یتیم لڑکی اپنے چچا کے بیٹے کی سرپرستی میں ہوتی تھی، وہ خوبصورت بھی ہوتی اور اس کے باپ کا چھوڑا ہو مال بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔ اس صورت میں اس کا چچازاد چاہتا تھا کہ اس کے بالغ ہونے پر وہ خود اس سے نکاح کر لے۔ (آسان ترجمہ ءِ قرآن، ص 447)

یہاں 'النساء' الابناء'نو مولود بیٹوں کے مقابل میں آیا ہے، اس لیے یہاں مراد نو مولود بچیاں ہیں۔ اس موقع پر 'النساء' کے لفظ کے استعمال میں کیا بلاغت ہے، جاوید احمد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

" لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر بیٹوں کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دینے کا ذکر کرتے ہوئے تمھاری عورتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے، تو شفقت پدری کا جذبہ ابھارتی ہے اور دوسری غیرت کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی ہے۔"(البیان)[49]

لیکن آیت 3 اور 127 میں ایسا کوئی قرینہ نہیں جو 'النساء' کو بچیوں کے مفہوم کی طرف پھیر دے۔

آیت 217 میں اسم موصول، "اللَّاتِي 'کا صلہ 'اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ '(جن کو تم ان کا مقرر شدہ حق نہیں دیتے، اور ان سے نکاح

49

کرنا بھی چاہتے ہو)' یتامی' سے متعلق نہیں ہے۔ یہ 'النساء' سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ ان یتیموں کی عورتوں کو حق مہر نہیں دینا چاہتے تھے مگر ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یہ نکاح یتیموں کی بھلائی کے ارادے سے کر رہے تھے، اس لیے یتیموں کی عورتوں یعنی ماؤں اور بڑی بہنوں وغیرہ کو حق مہر دینے میں انھیں رعایت ملنی چاہیے۔ انھیں بتایا گیا کہ ان عورتوں اور عام خواتین کے حقوق میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ ان کا حق مہر بھی دستور کے مطابق اادا کرنا ہو گا۔

آیت کا درست مفہوم درج ذیل ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے:

"وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ اُن سے کہہ دو کہ اللہ تمھیں اُن کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جن عورتوں کے حقوق تم ادا نہیں کرنا چاہتے، مگر اُن سے نکاح کرنا چاہتے ہو، اُن کے یتیموں سے متعلق جو ہدایات اِس کتاب میں تمھیں دی جارہی ہیں، اُن کے بارے میں اور (دوسرے) بے سہارا بچوں کے بارے میں بھی فتویٰ دیتا ہے کہ عورتوں کے حقوق ہر حال میں ادا کرو اور یتیموں کے ساتھ ہر حال میں

انصاف پر قائم رہو اور (یاد رکھو کہ اِس کے علاوہ بھی) جو بھلائی تم کرو گے، اُس کا صلہ لازماً پاؤ گے، اِس لیے کہ وہ اللہ کے علم میں رہے گی۔" (القرآن الکریم)

آیت کا یہ ترجمہ عربی کے ایک خاص اسلوب کی رعایت سے کیا گیا ہے۔ آیت میں سوال عورتوں سے متعلق پوچھا گیا تھا مگر ان کے حقوق ادا کرنے کی ہدایت لفظاً مذکور نہیں ہوئی، البتہ دیگر افراد کے حقوق کا ذکر ہوا ہے۔ مولانا اصلاحی اس مقام کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا' کا معطوف علیہ بن سکے۔ اِس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاق کلام کی روشنی میں معین کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہو گا کہ اِن عورتوں کو اِن کے مہر دو، اِن کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اِس کے اوپر 'وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ' کا عطف موزوں ہو گا۔ یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے، اُسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیت

'وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا' میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت 'وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ' میں اداے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو، لیکن مہر اور عدل کی کھکیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اِس طرح گویا قرآن نے آیات ۳-۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اِس فتوے کے ذریعے سے اُن میں دیے ہوئے احکام کو مزید موکد کر دیا۔"[50]

نابالغ یتیم بچیوں سے نکاح

سورہ نساء کی آیات 3 اور 127 سے یتیم بچیوں کے نکاح کے جواز کے موقف کی بنیاد قرآن مجید کے بیان کا کوئی تقاضا نہیں، بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت کا سوئے فہم ہے۔

بخاری شریف میں یہ روایت یوں نقل ہوئی ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ، حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ: «أَنَّهُ سَأَلَ

[50] تدبر قرآن ۲/۳۹۷

عَائِشَةَ عَنْ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: {وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى} فَقَالَتْ: يَا ابْنَ أُخْتِي، هَذِهِ الْيَتِيمَةُ تَكُونُ فِي حَجْرِ وَلِيِّهَا، تَشْرَكُهُ فِي مَالِهِ، وَيُعْجِبُهُ مَالُهَا وَجَمَالُهَا، فَيُرِيدُ وَلِيُّهَا أَنْ يَتَزَوَّجَهَا بِغَيْرِ أَنْ يُقْسِطَ فِي صَدَاقِهَا، فَيُعْطِيَهَا مِثْلَ مَا يُعْطِيهَا غَيْرُهُ، فَنُهُوا عَنْ أَنْ يَنْكِحُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يُقْسِطُوا لَهُنَّ، وَيَبْلُغُوا لَهُنَّ أَعْلَى سُنَّتِهِنَّ فِي الصَّدَاقِ، فَأُمِرُوا أَنْ يَنْكِحُوا مَا طَابَ لَهُمْ مِنَ النِّسَاءِ سِوَاهُنَّ. قَالَ عُرْوَةُ: قَالَتْ عَائِشَةُ: وَإِنَّ النَّاسَ اسْتَفْتَوْا رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ هَذِهِ الْآيَةِ، فَأَنْزَلَ اللهُ: {وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ} قَالَتْ عَائِشَةُ: وَقَوْلُ اللهِ تَعَالَى فِي آيَةٍ أُخْرَى: {وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ} رَغْبَةُ أَحَدِكُمْ عَنْ يَتِيمَتِهِ، حِينَ تَكُونُ قَلِيلَةَ الْمَالِ وَالْجَمَالِ، قَالَتْ: فَنُهُوا أَنْ يَنْكِحُوا عَنْ مَنْ رَغِبُوا فِي مَالِهِ وَجَمَالِهِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ إِلَّا بِالْقِسْطِ، مِنْ أَجْلِ رَغْبَتِهِمْ عَنْهُنَّ إِذَا كُنَّ قَلِيلَاتِ الْمَالِ وَالْجَمَالِ»[51]

عروہ بن زبیر نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیت « وإن خفتم أن لا تقسطوا في اليتامى » کا مطلب پوچھا۔ انہوں نے کہا میرے بھانجے اس کا مطلب یہ ہے

[51] بخاری، ۴۵۷۴

کہ ایک یتیم لڑکی اپنے ولی کی پرورش میں ہوتی اور اس کی جائے داد کی حصہ دار بھی ہوتی (ترکے کی رو سے اس کا حصہ ہوتا) اب اس ولی کو اس کی مال داری اور خوبصورتی پسند آ جاتی۔ وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا مگر انصاف کے ساتھ پورا مہر، یعنی جتنا مہر اس کو دوسرے لوگ دیتے، نہ دینا چاہتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لوگوں کو ایسی یتیم لڑکیوں کے ساتھ، جب تک ان کا پورا مہر انصاف کے ساتھ نہ دیں، نکاح کرنے سے منع فرمایا اور ان کو یہ حکم دیا کہ تم دوسری عورتوں سے جو تم کو بھلی لگیں نکاح کر لو۔ (یتیم لڑکی کا نقصان نہ کرو) عروہ نے کہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں، اس آیت کے اترنے کے بعد لوگوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں مسئلہ پوچھا، اس وقت اللہ نے یہ آیت «ویستفتونک في النساء» اتاری۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا دوسری آیت میں یہ جو فرمایا «وترغبون أن تنکحوھن» یعنی وہ یتیم لڑکیاں جن کا مال و جمال کم ہو اور تم ان کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ان یتیم لڑکیوں

سے جن کا مال و جمال کم ہو نکاح کرنا نہیں چاہتے تو مال اور جمال والی یتیم لڑکیوں سے بھی جن سے تم کو نکاح کرنے کی رغبت ہے نکاح نہ کرو، مگر اسی وقت کر سکتے ہو جب انصاف کے ساتھ ان کا مہر پورا ادا کرو۔

اس روایت میں مذکور یتیمہ سے مراد نابالغ یتیم بچی سمجھ لیا گیا ہے۔ عام بول چال میں یتیم کا لفظ بالغ لڑکے اور لڑکی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے مروی درج بالا روایت میں یہ اس معنی میں استعمال بھی ہوا ہے:

اليتيمةُ تُسْتَأْمَرُ في نفسِها ، فإنْ صمتَتْ فهو إذنُها ، وإنْ أبَتْ ، فلا جوازَ علَيْها[52]

"یتیم لڑکی سے اس کی رضامندی حاصل کی جائے گی، اگر وہ خاموش رہی تو یہی اس کی رضامندی ہے، اور اگر اس نے انکار کیا تو اس پر (زبردستی کرنے کا) کوئی جواز نہیں"۔

ابن رشد 'بدایۃ المجتھد' میں لکھتے ہیں:

---

[52] ترمذي، رقم:1109

وَالْيَتِيمُ لَا يَنْطَلِقُ إِلَّا عَلَى غَيْرِ الْبَالِغَةِ. وَالْفَرِيقُ الثَّانِي قَالُوا أَنَّ اسْمَ الْيَتِيمِ قَدْ يَنْطَلِقُ عَلَى بَالِغَةٍ بِدَلِيلِ قَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ -: «تُسْتَأْمَرُ الْيَتِيمَةُ» ، وَالْمُسْتَأْمَرَةُ هِيَ مِنْ أَهْلِ الْإِذْنِ وَهِيَ الْبَالِغَةُ[53]

"یتیم مطلقا نابالغ کے لیے بولا جاتا ہے (جس کا والد نہ ہو) جب کہ دیگر فقہا کے مطابق یتیم کے اسم کا اطلاق بالغ پر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ یہ قول ہے، "یتیمہ سے اس کے نکاح کے لیے پوچھا جائے گا" اور جس سے پوچھا جائے وہ صاحب اذن ہوتی ہے اور صاحب اذن بالغ ہوتا ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یتیم لڑکیوں کے نکاح اور ان کے مال اور حقِ مہر کا معاملہ یقیناً قابلِ نکاح بالغ یتیم لڑکیوں ہی سے متعلق تھا۔

[53] بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد (3/35)
محقق علامہ شعیب الانووط نے اس حدیث کو مسند احمد کے حوالے سے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اسناد کو حسن کہا ہے۔ مسند أحمد ط الرسالۃ (4/195)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا اس روایت میں آیت کا سببِ نزول نہیں بیان کر رہیں بلکہ اس کا ایک مصداق بتا رہی ہیں۔ صحابہ کے ہاں رائج اصطلاح میں یوں کہنا کہ فلاں آیت فلان مسئلے یا واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی، کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس مسئلے یا واقعے پر اس آیت کے معنی یا حکم کا اطلاق ہوتا ہے یا وہ اس کا مصداق بنتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اپنے کتاب 'الفوز الکبیر' میں لکھتے ہیں:

«أن الصحابة والتابعين رضي الله عنهم أجمعين- كثيرا ما يقولون: "نزلت الآية في كذا" ولا يكون غرضهم إلا تصوير ما تصدق عليه الآية من الأحداث والمعاني، وذكر بعض القصص والوقائع التي تشملها الآية الكريمة لعموم لفظها، سواء كانت القصة متقدمة على نزول الآية أو متأخرة عنها[54]

صحابہ اور تابعین اکثر یوں کہتے تھے کہ 'یہ آیت فلاں واقعے کے بارے میں نازل ہوئی'۔ اس سے ان کی غرض محض ذہن میں یہ نقش بٹھانا ہوتا تھا کہ ان

[54] الفوز الکبیر في أصول التفسیر، ص176

واقعات اور معانی پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ بعض قصے اور واقعات
بھی ذکر کرتے جن کو آیت کریمہ اپنے الفاظ کے عموم میں شمار کر لیتی تھی،
چاہے وہ قصہ نزولِ آیت سے پہلے واقع ہوا ہو یا اس کے بعد۔

امکان یہی ہے کہ حضرت عائشہ کی روایت میں یتیم بالغ لڑکیوں کو پیش آنے والے حق تلفی کے مسائل انھیں آیات میں مذکور عورتوں کے ساتھ بے انصاف کے مصداق کے طور پر بیان کیے گئے، مگر یتیم کے ذکر سے بات یوں سمجھی گئی کہ یہ آیت میں مذکور 'یتامی' سے متعلق ہے۔ پھر یتامی کا مفہوم نابالغ بچی لے کر یہ باور کر لیا گیا کہ قرآن مجید میں نابالغ بچیوں کے نکاح کے معاملے میں ان کی حق تلفی سے منع کر رہا ہے اور یوں گویا اجازت دے رہا ہے کہ اگر حق تلفی کا اندیشہ نہ ہو تو نابالغ یتیم بچی کا ولی اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

قرآن کے الفاظ کی دلالتوں اور روایت کی اس توجیہ کے بعد یہ غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔

نابالغ کی عدت کا مسئلہ

قرآن مجید کی جس آیت سے نابالغ کی عدت اور اس کی بنا پر نابالغ کے ساتھ نکاح اور اس کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم کرنے کا جواز اخذ کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے:

{وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ} [الطلاق، 65: 4]

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

> اور تمہاری عورتوں میں سے جو ماہواری آنے سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو (یاد رکھو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے، اور ان عورتوں کی (عدت) بھی (یہی ہے) جنہیں ابھی ماہواری آئی ہی نہیں۔ (آسان ترجمہ ٔ قرآن، از مولانا تقی عثمانی)

"اللَّائِي لَمْ يَحِضْن "کا بے غبار مطلب وہی ہے جو درج بالا ترجمے میں اختیار کیا گیا یعنی جن عورتوں کو ماہواری نہیں آئی۔ صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ اس سے وہ عورتیں مراد ہیں جنھیں کسی سبب سے ماہواری نہیں آئی۔ یہاں بغیر کسی سبب کے نابالغ بچیاں مراد

لینے کے لیے کوئی قرینہ یا تقاضا موجود نہیں۔ نابالغ بچیوں کے لیے حمل ٹھیرنے کا امکان ہی نہیں ہوتا کہ عدت ان پر لاگو کی جاسکے۔ یہ لازماً بالغ عورتیں ہی ہیں جن کے لیے حمل کا امکان موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے عدت کا حکم لاگو کیا گیا ہے۔

آیت کا یہ موقع نکاح، حمل اور عدت کے بیان کا ہے۔ اس موقع پر عورتیں بول کر بچیاں مراد لینے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر نابالغ بچیاں مراد ہوتیں تو 'جاریۃ' یا کوئی دوسرا مترادف لفظ اختیار کیا جاتا یا کوئی مضبوط قرینہ مہیا کیا جاتا جیسا اوپر سورہ بقرۃ کی آیت 49 میں موجود ہے۔ لہذا، زیر بحث آیت میں 'النساء' کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہ وہ عورتیں ہیں جنھیں حیض نہیں آیا، ان کی عدت تین ماہ ہے۔

اس آیت کا درست مفہوم درج ذیل ہے:

"تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا، اُن کے بارے میں اگر کوئی شک ہے تو اُن کی عدت تین مہینے ہو گی۔ (البیان، از غامدی)

غامدی صاحب اس آیت کے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں:

"اصل میں 'وَاللّٰائی لَم یَحِضْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'لَمْ' عربی زبان میں نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اِس سے وہ بچیاں مراد نہیں ہو سکتیں جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔"

(البیان، از غامدی)

نکاح کی اہلیت

یہ طے ہو جانے کے بعد قرآن مجید میں نابالغ سے نکاح کی اجازت یا ان کی عدت کے بارے میں کوئی ہدایت موجود نہیں، اب ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں نکاح کے لیے محض بلوغت ہی نہیں، بلکہ 'رشد' یعنی سمجھ داری جیسی خصوصیات ملحوظ رکھنے کی رہنمائی ملتی ہے۔

رشد

قرآن مجید میں یتیموں کا مال ان کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت دی گئی ہے کہ مال جیسی قیمتی اور سہارا دینے والی چیز ان کی بلوغت کی عمر کے بعد ان کے حوالے کرنے سے پہلے

انھیں آزما کر دیکھ لیا جائے کہ ان میں 'رشد' یعنی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کی اہلیت بھی موجود ہے یا نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

{وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا وَابْتَلُوا الْيَتَامَى حَتَّى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا} [النساء: 5، 6]

اور (یتیم اگر ابھی نادان اور بے سمجھ ہوں تو) اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمھارے لیے قیام وبقا کا ذریعہ بنایا ہے، اِن بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو۔ ہاں، اِن سے فراغت کے ساتھ اُن کو کھلاؤ، پہناؤ اور اُن سے بھلائی کی بات کرو۔ اور نکاح کی عمر کو پہنچنے تک اِن یتیموں کو جانچتے رہو، پھر اگر اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو، اور اس اندیشے سے کہ

بڑے ہو جائیں گے، اُن کے مال اڑا کر اور جلد بازی کر کے کھا نہ جاؤ۔ اور (یتیم کا) جو (سرپرست) غنی ہو، اُسے چاہیے کہ (اُس کے مال سے) پرہیز کرے اور جو محتاج ہو، وہ (اپنے حق خدمت کے طور پر) دستور کے مطابق (اُس سے) فائدہ اٹھائے۔ پھر جب اُن کے اموال اُن کے حوالے کرنے لگو تو اُن پر گواہ ٹھیرا لو، ورنہ حساب کے لیے تو اللہ کافی ہے۔(البیان)

مال جیسی قیمتی متاع اگر محض بلوغت کی بنیاد پر یتیم کے حوالے نہیں کر دی جاتی بلکہ بلوغت کے بعد سمجھ داری اور معاملہ فہمی کا امتحان بھی لیا جاتا ہے تو نکاح جیسے سنجیدہ معاملے میں بھی محض بلوغت کو کافی نہیں سمجھا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ نابالغ اور نو بالغ کے نکاح کے جواز کے مسئلے پر بحث فقط علمی اور نظریاتی سطح پر کی جاتی ہے، عملاً ہر معقول شخص ایسے نکاح کی قباحتوں سے واقف اور اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ نو بالغ کے نکاح کے اکا دکا واقعات تو پیش آ جاتے ہیں، مگر نابالغ کے نکاح اور پھر اس کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کر لینا، غیر متمدن سماجوں میں بھی قبیح ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر طرفہ تماشا ہے کہ خدائے رحیم و حکیم کے بارے میں یہ تصور کر لیا

گیا ہے کہ اس نے بچوں خصوصاً بچیوں کی اس حق تلفی بلکہ ان کے ساتھ اس زیادتی کی اجازت دے رکھی ہے!

نکاح میں فرد کا اختیار

قرآن مجید نے یہ طے کر دیا ہے کہ اپنے نکاح کا اختیار فرد ہی کے پاس ہے۔ اس معاملے میں اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (سوره االبقرة، 2: 232)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو اب اِس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کر لیں، جب وہ دستور کے مطابق آپس میں معاملہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ یہ نصیحت تم میں سے اُن لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے

ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ شایستہ اور زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (البیان، از غامدی)

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (سوره البقرة، 2: 234)

"اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔" (البیان، از غامدی)

قرآن مجید میں اپنے نکاح کے اختیار کا یہ معاملہ بیوہ اور مطلقہ کے نکاح ثانی سے متعلق بیان ہوا ہے مگر اسے شوہر دیدہ کے اختیار تک محدود کرنا اور کنواری کو اس میں شامل نہ سمجھنا محض حرفیت پسندی ہے۔ معاملہ چوں کہ بیوہ اور مطلقہ کا سامنے آیا تو قرآن نے تبصرہ بھی اسی پر کیا ہے۔ کنواری کے اختیار کی ممانعت نہیں کی گئی۔ عورتوں کا یہ اختیار

اس اصول پر مبنی ہے کہ فرد کے اپنے حقوق میں اصل اختیار اسی کا ہے۔ جس طرح کسی فرد پر اس کے مال کے معاملے میں کوئی جبر روا نہیں، اسی طرح اس کے نکاح کے معاملے میں بھی اس پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا، خواہ، وہ مرد ہو یا عورت، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔

رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس معاملے جو مقدمات پیش ہوئے، اس میں آپؐ نے شوہر دیدہ اور کنواری میں کوئی فرق نہیں کیا۔ آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت کنواری ہو یا شوہر دیدہ ضروری ہے کہ اس کے نکاح کے لیے اس کی مرضی معلوم کی جائے گی۔ نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔

روایت یہ ہے:

«لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ، وَلَا الثَّيِّبُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ. فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ، كَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: إِذَا سَكَتَتْ[55]

[55] صحيح بخاري، رقم:6968

کسی کنواری لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ لے لی جائے اور کسی بیوہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کا حکم نہ معلوم کر لیا جائے۔"

نیز آپ سے صراحتاً مروی ہے کہ یتیم لڑکی سے اس کی مرضی معلوم کی جائے:

اليتيمةُ تُسْتَأْمَرُ في نفسِها ، فإنْ صمتَتْ فهو إذنُها ، وإنْ أبَتْ ، فلا جوازَ علَيْها[56]

یتیم لڑکی سے اس کی رضامندی حاصل کی جائے گی، اگر وہ خاموش رہی تو یہی اس کی رضامندی ہے، اور اگر اس نے انکار کیا تو اس پر (زبردستی کرنے کا) کوئی جواز نہیں"۔

اور جس کی مرضی معلوم کی جائے وہ بالغ ہی ہوتا ہے۔ یہاں لفظ 'یتیم' عام بول چال کے مطابق استعمال ہوا ہے، یعنی وہ لڑکی جس کا باپ نہ ہو۔ یہاں کا اس کا نابالغ ہونا متصور نہیں۔

[56] ترمذي، رقم:1109

جب یہ طے ہے کہ عورت کا نکاح اس کی اجازت سے مشروط ہے تو یتیم بچی کا نکاح کرانے کا جواز ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ نہ نکاح کی اہلیت رکھتی ہے اور نہ اس کی اجازت معتبر ہے۔ اور اگر اس کی اجازت ہی نہیں تو اس کا نکاح کیا ہی نہیں جا سکتا۔

قانونی مداخلت کا اختیار

فقہا یتیم بچیوں کے نکاح کے اس معاملے میں ایک حد میں قانون کی مداخلت کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔

قرطبی لکھتے ہیں:

وَلِلسُّلْطَانِ النَّظَرُ فِيمَا يَفْعَلُهُ الْوَصِيُّ مِنْ ذَلِكَ[57]

"سلطان (حاکم) کو اختیار ہے کہ وصی (عورت کا ولی) اس معاملے میں جو کرے اس پر نظر رکھے۔"

مفتی شفیع اپنی تفسیر، 'معارف القرآن' میں لکھتے ہیں:

[57] «تفسير القرطبي = الجامع لأحكام القرآن» (5/11):

"ذمہ دارانِ حکومت کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس کی نگرانی کریں، کسی جگہ حق تلفی ہوتی نظر آئے تو بزور قانون حقوق ادا کرائیں۔"[58]

جب یہ واضح ہے کہ نابالغ کا نکاح ہی اس کی حق تلفی ہے تو اسے قانون کی رو سے مطلقاً منع کیا جا سکتا ہے۔ اس واضح عقلی تقاضا کو تسلیم نہ کرنے کے پیچھے مذکورہ آیات کا وہ فہم کھڑا ہے جس میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یتیم کی حق تلفی کی جتنی اجازت خدا نے دے رکھی ہے، اور قانون وہاں مداخلت نہیں کر سکتا۔ ان آیات کا مفہوم واضح ہو جانے کے بعد یہ مانع بھی باقی نہیں رہتا۔

حضرت عائشہ کے کم سنی کے نکاح کی روایت

کم سنی کے نکاح کے جواز میں حضرت عائشہ کی کم سنی میں نبی کریم ﷺ سے نکاح کی روایات پیش کی جاتی ہیں۔

[58] معارف القرآن، ج2، ص286

کم سنی کی شادیاں تمدنی ضرورتوں کے تحت ہوتی رہی ہیں۔ مگر یہ عمل کسی عمومی جواز کے لیے کوئی وجہ نہیں بنتا۔ کم سن بچوں کے نکاح دورِ رسالت میں بھی عام نہیں تھیں۔ اس بارے میں اکا دکا واقعات ہی ملتے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر ان کے نکاح کا ذکر ہے۔ تاہم بلوغت سے قبل رخصتی یا زن و شو کا تعلق قائم کر لینے کی کوئی نظیر موجود نہیں۔

جہاں تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کم سنی میں نکاح و رخصتی کی روایت کا تعلق ہے تو یہ کئی پہلوؤں سے قابلِ نقد ہے:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اس نکاح کی تجویز آپؐ کو رفاقت مہیا کرنے اور خانگی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ ایک چھے برس کی بچی سے ان امور کو نبھانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔[59]

عربوں کے ہاں سنین کو تعیین کے ساتھ یاد رکھنے کا رواج نہ تھا۔ چوں کہ کیلنڈر بہت بعد دیر بعد، حضرت عمر کے دورِ خلافت میں مقرر ہوا تھا، اس لیے اس سے پہلے پیدا ہونے

[59] جاوید احمد غامدی، مقامات، ص 323-327

والوں کی عمر کا حساب اندازے سے کیا جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بوقتِ نکاح ور خصتی اپنی عمر اندازے سے بتائی ہو گی جس میں چند برس کا فرق ہونا سمجھا جا سکتا ہے۔[60]

یہی معاملہ ان کی وفات کی عمر کا ہے جو بقول مورخین سن 58 ہجری میں 66 برس کی عمر میں ہوئی۔ 66 میں سے 58 منہا کریں تو بوقت ہجرت حضرت عائشہ کی عمر 8 برس بنتی ہے۔ لیکن یہاں بھی ضروری نہیں کہ ان کی اصل عمر 66 برس ہی ہو۔ جب پیدائش کے سن میں چند برس کے فرق کا امکان تسلیم ہے تو بوقت وفات عمر میں بھی لامحالہ تسلیم کرنا ہو گا۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جیسی خوش گوار زندگی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گزاری، اس میں انھیں کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ ان کی شادی کم سنی

[60] عدنان اعجاز، بوقت نکاح ور خصتی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر، ماہنامہ الشریعہ، دسمبر 2016

میں کرادی گئی تھی۔ آپ کا یہ نکاح یقیناً اسی عمر میں ہوا جب آپ نکاح کی اہلیت حاصل کر چکی تھیں۔ اس لیے محض روایت کے الفاظ سے حجت پکڑنا درست نہیں۔

یہ ایک مسلّمہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ نو بالغ بچیاں شادی کی ذمہ داریوں کا تحمل نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں صحت کا جو عمومی معیار ہے وہ نوجوانوں میں بھی قابل رشک نہیں، چہ جائے کہ نو بالغ بچوں اور بچیوں کو ازدواجی تعلقات کی پیچیدگیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ بچے کے حمل و پیدائش کے نازک مراحل ایک صحت مند نوجوان عورت ہی برداشت کر سکتی ہے۔ اسی طرح لڑکے کے لیے بھی ضروری ہے کہ نکاح کے وقت وہ عمر کے اس حصے میں ہو جہاں وہ جسمانی طور پر زوجیت کے حقوق ادا کرنے کے علاوہ نان و نفقہ کی ذمہ داری اٹھانے کے بھی قابل ہو۔ اس سلسلے میں وعظ و تلقین کے علاوہ قانون سازی سے بھی معاملات کو درست رکھنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ دین و شریعت کے اس کے موید ہیں، مخالف نہیں۔

کتابیات

1. القرآن المجید
2. آسان ترجمہ قرآن، مولانا تقی عثمانی۔ کراچی: مکتبہ معارف القرآن، 2011ء
3. التفسير من سنن سعيد بن منصور–مخرجا، سعيد بن منصور۔ الرياض: دار الصميعي للنشر والتوزيع، الطبعة: الأولى، 1997ء
4. الحوادث والبدع، محمد بن الوليد أبو بكر الطرطوشى المالكي (المتوفى: 520ھ)۔ الدمام: دار ابن الجوزي، 1998ء
5. الفوز الکبیر، شاہ ولی اللہ۔ القاهرة : دار الصحوة، 1986ء
6. المبسوط، محمد بن أحمد السرخسی۔ مصر: مطبعة السعادة، 1431 ھ
7. المعجم الأوسط،ابو القاسم، سلیمان بن احمد۔ القاهرة: دار الحرمين.
8. القرآن الكريم،جاوید احمد غامدی۔ لاہور: المورد، 2021
9. تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی۔ لاہور، فاران فاؤنڈیشن، 2009
10. تفسير القرآن العظيم، حافظ ابن کثیر۔ دار طيبة للنشر والتوزيع، 1999ء
11. ديوان الضعفاء، أبو عبد الله محمد بن أحمد الذهبي۔ مكة: مكتبة النهضة الحديثة، 1967ء
12. سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها،ناصر الدين الالبانی۔ الرياض: مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، 1995ء
13. سنن الترمذی، محمد بن عیسی الترمذی۔ بیروت: دار الغرب الاسلامی،1998ء
14. صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری۔ بیروت: دار طوق النجاة،2021ء
15. صحيح وضعيف سنن الترمذي، ناصر الدين الألباني۔ إسكندرية: برنامج منظومة التحقيقات الحديثية

16. صحيح مسلم، مسلم بن حجاج۔ بيروت: دار إحياء التراث العربي.
17. ضعيف الترمذي، ناصر الدين الالبانی۔ بيروت: المكتب الاسلامي، 1991ء
18. ضعيف الجامع الصغير وزيادته، ناصر الدين الالبانی۔ بيروت: ناشر: المكتب الإسلامي.
19. مسند الامام احمد بن جنبل، احمد بن حنبل الشيبانی۔ بيروت: مؤسسة الرسال، 2001ء
20. مشكاة المصابيح، محمد بن عبد الله،التبريزی۔ بيروت: المكتب الإسلامي، 1985 ء
21. مصنف ابن ابی شيبة، أبو بكر بن أبي شيبة۔ الرياض: مكتبة الرشد، 1989ء
22. معارف القرآن، مفتی محمد شفیع۔ کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ، 2008ء
23. مقامات، جاوید احمد غامدی۔ لاہور: المورد، 2014ء
24. ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ: الشریعہ اکیڈمی